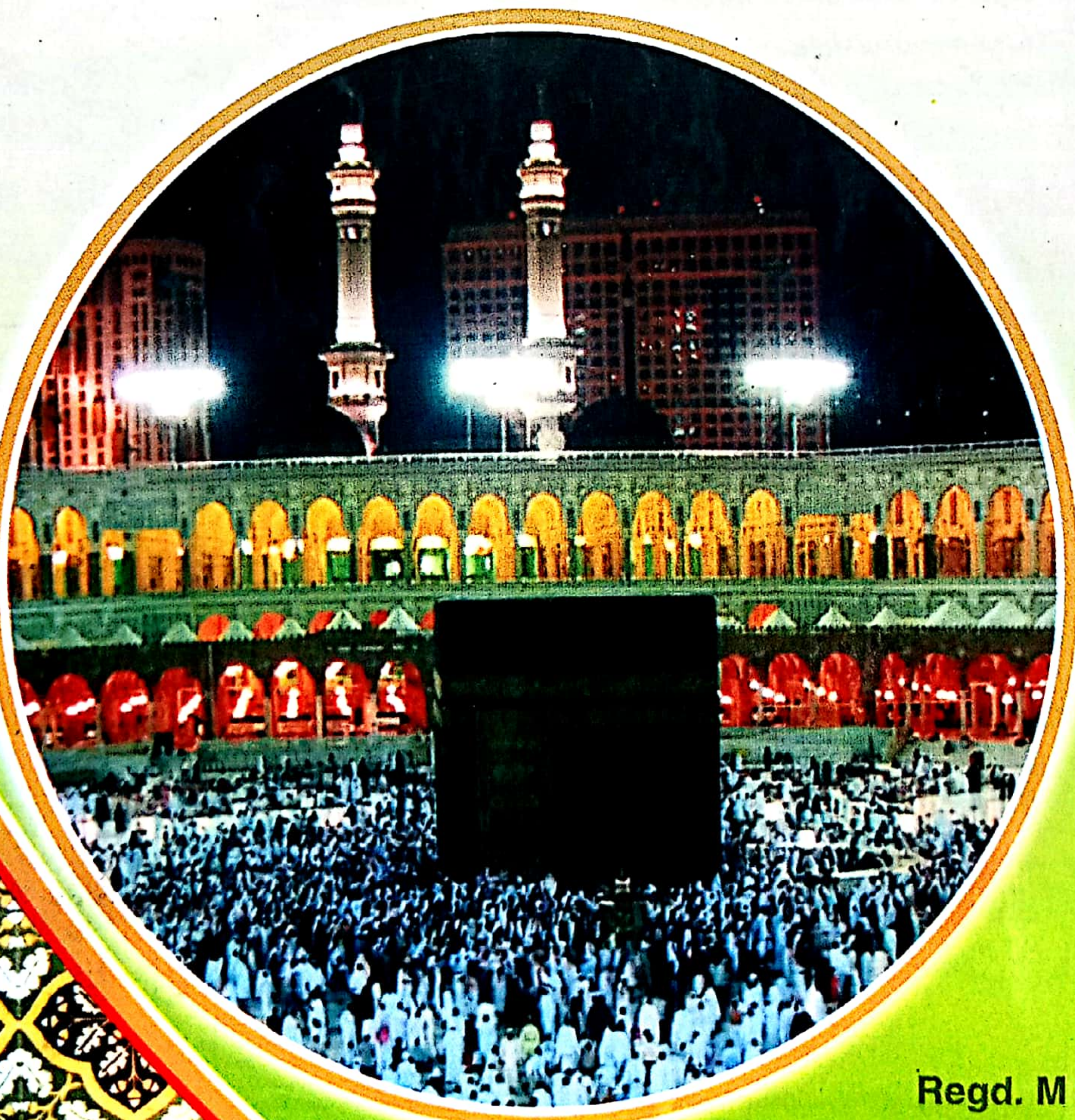
وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

وفاق المدارس

ملتان

شمارہ نمبر ۴ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ اپریل 2010ء



Regd. M # 182

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سالانہ امتحانات انشاء اللہ العزیز

بتاریخ 10 جولائی 2010ء بروز ہفتہ بمطابق 27 رجب المرجب ۱۴۳۱ھ

سے شروع ہونگے (ادارہ)

تصحیح

شمارہ بابت ماہ صفر المظفر میں "مدارک التنزیل" کے تعارف وتبصرہ میں عربی عبارت اور اس کے اردو ترجمہ میں کچھ جملے کمپوز ہونے سے رہ گئے تھے، جس کی وجہ سے معنی میں خلل پیدا ہو گیا تھا، پوری عبارت مع ترجمہ یوں ہے۔

"قد سألني مَن تَتعيَّنُ إجابتهُ كتاباً وَسَطًا في التأويلاتِ، جامعاً لوُجوهِ الإعرابِ والقراء ات، مُتَضَمّنا لدقائق علمَي البديعِ و الإشاراتِ، حافلاً بأقاويل أهل السنة والجماعة، خالياً من أباطيل أهل البدع والضلالة......

یعنی: "مجھ سے کچھ ایسے ساتھیوں نے جن کو ٹالنا ممکن نہ تھا، مطالبہ کیا کہ ایسی تفسیر لکھوں جو متوسط، وجوہ اعراب اور مختلف قراءتوں کو جامع، علم بدیع واشارات کی باریکیوں پر مشتمل، اہل سنت وجماعت کے اقوال سے مزین اور اہل بدعت وضلال کی غلاظتوں اور من گھڑت باتوں سے پاک صاف ہو.........

فہرست مضامین

صدائے وفاق

سراپا ہدایت وکمالات	شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان	۳

مقالات مضامین

دینی مدارس، تاریخ ساز علمی ادارے	حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری	۸
تحفظ مدارسِ دینیہ کنونشن لیہ و کہروڑ پکا	رپورٹ مولانا زبیر احمد صدیقی	۱۳
دینی مدارس کی تاریخ	حضرت مولانا مفتی سید عبدالشکور ترمذی	۱۷
ایمان، جان سے زیادہ عزیز ہونا چاہئے	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ	۴۰
اسلام اور تعلیم نسواں	محمد خلیل اللہ	۴۳
امت مسلمہ کے خلاف یہودی سازشیں	محمد عمر عثمانی	۴۷
میڈیا......اسلام کے خلاف مغرب کا مؤثر ہتھیار	پروفیسر عبدالعظیم جانباز	۵۴
عیسائی مظالم کی ایک جھلک	پروفیسر محمد حسان خان	۵۹

وہ کتابیں اپنے آباء کی

مدارک التنزیل وحقائق التاویل	مولانا نور رحمٰن ہزاروی	۲۹

وفیات

علماء کرام کی المناک شہادت	ادارہ	۱۲

تعارف و تبصرہ

تبصرہ کتب	تبصرہ نگار۔ن۔ر	۶۲

سالانہ بدل اشتراک

بیرون ملک امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک ۳۰ ڈالر۔ سعودی عرب، انڈیا اور متحدہ عرب امارات وغیرہ ۲۳ ڈالر۔ ایران، بنگلہ دیش ۲۰ ڈالر۔

اندرون ملک قیمت: فی شمارہ: ۱۵ روپے، زرِ سالانہ مع ڈاک خرچ: ۱۸۰ روپے

سراپا ہدایت وکمالات

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح نبوت اور رسالت عطا فرمائی ہے اسی طرح ختم نبوت اور ختم رسالت کی خلعت سے سرفراز فرمایا ہے، آپ نبی بھی ہیں اور خاتم النبیین بھی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسول بھی ہیں اور خاتم الرسل بھی ہیں۔ صرف یہی بات نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوگئی ہے اور اب کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا اور رسالت ختم ہوگئی، اب کوئی رسول پیدا نہیں ہوگا بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبوت کا اختتام اور رسالت کی تکمیل بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے فرمائی، قرآن مجید میں ہے:

﴿واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون O﴾ (الصف: ۸) اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا ہوا ہے کہ وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھیج کر اپنے نور کو مکمل فرمائیں گے، چاہے کافروں کو کیسا ہی ناگوار نہ ہو۔

﴿ویأبی اللہ إلا أن یتم نورہ ولو کرہ الکافرون O﴾ (التوبہ: ۳۲) اللہ تعالیٰ اپنے نور کو مکمل کریں گے چاہے کافر کتنا ہی ناگوار محسوس کریں۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر قرآن پاک کی اور آیت نازل ہوئی:

﴿الیوم أکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتي ورضیت لکم الإسلام دینا O﴾ (المائدہ: ۳) آج ہم نے آپ کے لئے آپ کے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور آپ کے لئے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔

گویا یہ بشارت دی گئی کہ ہم نے اپنے نور کو مکمل کر دیا ہے یا یوں سمجھئے کہ نبوت کے ساتھ ساتھ ختم نبوت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفراز کیا گیا ہے اور ختم نبوت کے ساتھ ساتھ اللہ نے اس نبوت کی تکمیل بھی کر دی۔ تکمیل کرنا اور اس کے مکمل کرنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس نبوت کا نور اور فیض رہتی دنیا تک قائم ہوگا۔ اب قیامت تک آنے والے انسانوں کی ہدایت کے لئے اسی نبوت اور رسالت کاملہ کو جس کے اندر کسی طرح کوئی کمی نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ذریعہ بنائیں گے۔ قیامت تک آنے والے انسانوں کی رہبری اور رہنمائی کے لئے اب کوئی رہنما اور کوئی رہبر معتبر اور قابل قبول نہیں۔ فقط رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی اور رہبری قابل قبول ہے۔

جب کسی شخص کو نبوت عطا کی جاتی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو اپنی معرفت کا بلند مقام عطا کرتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں اس شخص کی قبولیت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے، وہ اللہ کا برگزیدہ بندہ قرار پاتا ہے، اس کے اخلاق اعلیٰ ہوتے ہیں اس کا کردار بلند ہوتا ہے، اس کے اعمال پسندیدہ ہوتے ہیں، اس کے جذبات انتہائی پاکیزہ ہوتے ہیں، وہ خلق خدا کے لئے رحمت اور شفقت کا مجسمہ ہوتا ہے، خلق خدا کی رہبری کے لئے وہ ہر طرح کی اذیت اور تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے، یہ تمام کی تمام صفات اس شخص کے اندر یقیناً ہوتی ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں۔

یعنی اگر کوئی آدمی بہت زیادہ مجاہدہ کر رہا ہے اور ہمہ وقت اللہ کی یاد میں مست رہتا ہے تو اس طرح کے عمل کرنے کی وجہ سے ترقی کرتے کرتے وہ نبوت کے مقام تک پہنچ جائے، یہ ناممکن ہے، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ جس کو اللہ نبوت عطا فرماتے ہیں وہ نبی ہوتا ہے۔ نبوت کوئی ڈگری نہیں ہے، یہ ایک عہدہ ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے مڈل پاس کیا اور مڈل کا سرٹیفکیٹ آپ کو مل گیا، اس کے بعد آپ نے میٹرک پاس کیا تو میٹرک کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ انٹر پاس کیا اس کی سند آپ کو مل گئی۔ آپ درجہ بدرجہ پڑھتے چلے جائیں، امتحان پاس کرتے چلے جائیں، ڈگریاں آپ کے پاس اکٹھی ہوتی چلی جائیں گی، آپ یوں چاہیں کہ آپ کلکٹر بن جائیں تو یہ ممکن نہیں، کیونکہ یہ تو ایک منصب ہے، ایک عہدہ ہے جو اوپر سے تجویز کیا جاتا ہے، فلاں شخص کلکٹر بنا دیا گیا ہے، یہی حال نبوت کا ہے کہ اوپر سے انتخاب ہوتا ہے۔ یہ ذکر کیا، نفس کشی کی اور اس کے بعد پہنچتے پہنچتے نبوت کے مقام تک آ گئی، لہٰذا نبی ہو گئے۔ یہ بات نہیں ہے، یہ ایک منصب اور عہدہ ہے جو عطا کیا جاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جس کے لئے فیصلہ کرتے ہیں اس کو نبوت عطا کرتے ہیں:

﴿اللہ یصطفي من الملئکة رسلا ومن الناس ۝﴾ (الحج: ۷۵) اللہ تبارک وتعالیٰ انتخاب کرتا ہے۔ ملائکہ میں سے جبرائیل کا انتخاب کیا جو اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر نبیوں کے پاس آیا کرتے تھے، نبیوں میں سے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سب نبیوں کا انتخاب کیا۔

نبی اپنے تمام کمالات کے اندر ممتاز ہوتا ہے، مثال کے طور پر دانش مندی اور عقل کو لے لیجئے، عقل اور دانش مندی جیسے نبی کے پاس ہوتی ہے اور کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ سرور کائنات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب ازل سے ہو چکا تھا کہ آپ کو نبوت اور رسالت سے سرفراز کیا جائے گا اور ختم نبوت اور ختم رسالت کا تاج پہنایا جائے گا اور نبوت اور رسالت کی تکمیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہوگی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی دانش مندی اور عقل مندی عطا فرمائی جو اور کسی کو نہ دی۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ بتاتی ہے کہ آپ میں بچپن ہی سے اس کے آثار نمایاں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچپن میں بکریاں بھی چرائی ہیں۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ اللہ نے سب نبیوں سے بکریاں چروائی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا ایک انداز ہے، بکری ایک معصوم سا مسکین جانور ہے، جو چارے کی بناء پر کسی اور سبب سے ریوڑ سے

نکل جاتا ہے تو چرواہا بے چارہ اس کو ریوڑ میں شامل کرتا ہے۔ایسا دن میں بہت مرتبہ ہوتا ہے اور جانور کے مسکین ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ شفقت اور نرمی کا معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ چرواہا جب اس کو لے کر آتا ہے تو اس کی گردن میں ہاتھ ڈال لیتا ہے اور اس کو آہستہ آہستہ کھینچ کر ریوڑ میں شامل کرتا ہے،تو اسی طرح سے انبیاء کرام سے ابتدا میں بکریوں کی دیکھ بھال کرائی گئی۔اس لئے کہ آئندہ امت ان کے سپرد کی جانے والی تھی اور انہیں امت کی بے راہ روی اور غلط انداز پر صبر اور تحمل کو اختیار کرنا تھا،اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیاء کی تربیت فرمائی۔لہٰذا دانش کا یہ انداز پیدا کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بکریاں چروائی گئیں۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم جوان ہوئے تو تجارت شروع کی۔تجارت کے اندر آپ کا کمال کیا تھا؟ یہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو الصادق الامین کا لقب دیا گیا تھا، یہ اس لئے دیا گیا تھا کہ تجارت کے اندر آپ کا انداز اور آپ کا طریقہ ہمیشہ صحیح اور درست ہوتا تھا۔جس کی بناء پر قوم نے بالاتفاق آپ کو الصادق اور الامین کا لقب دیا۔یہ اصل میں آپ کے کاروباری حسن اور کاروباری طریقہ کی خوبی کا ایک اعتراف تھا۔سرورکائنات جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ جیسے شہر کے اندر جو تجارت کا مرکز تھا، پوری قوم نے یہ لقب عطا کیا کیونکہ آپ کی تجارت کے اندر خوبی تھی، ہر ایک کی رعایت تھی، اصول کی پابندی تھی، جو کسی دوسرے میں موجود نہ تھی۔

اور پھر آپ کو معلوم ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو ان کی پاک دامنی کی وجہ سے ان کے اخلاق کی عمدگی کی بناء پر لوگوں نے طاہرہ کا لقب دے رکھا تھا۔وہ پاک دامن بھی تھیں اور اپنی تجارت کے اصول میں حق وصداقت کا خیال بھی رکھتی تھیں۔ بڑے بڑے لوگ اور اچھے اچھے سردار حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے خواہش منداور متمنی تھے،انہوں نے سب کو رد کر کے خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کا پیغام بھیجا اور درخواست کی اور نکاح ہو گیا۔یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل اور دانائی کی دلیل ہے، اسی عقل اور دانائی کی وجہ سے آپ کو پوری قوم میں امتیاز حاصل ہوا،اس میں کسی کو اشکال نہیں اور کوئی اعتراض بھی نہیں۔اس وقت تک نبوت کی بات سامنے ہی نہیں تھی۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی کا واقعہ ہے کہ حلف الفضول کے لئے حضور اکرم نے جوانوں کو منظم کیا اور ان سے اس بات پر عہد لیا کہ ہم ظالم کو ظلم کرنے سے روکیں گے، مظلوم کی مدد واعانت کریں گے اور کسی مظلوم کے اوپر ظلم برداشت نہیں کریں گے، چاہے اس کے لئے ہمیں اپنی جان کی بازی لگانے پڑے۔ سرورِ کائنات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اقدام بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی اعلیٰ درجے کی عقل وفہم عطا فرمائی تھی۔ جہاں ظلم کا بازار گرم رہتا تھا، جہاں ظلم اور زیادتی کو جرم ہی نہیں سمجھا جاتا تھا، کمزوروں پر زیادتی رات دن کا مشغلہ تھا ،وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوانوں کو ظلم کے خلاف منظّم کیا۔آپ بعد میں بھی فرمایا کرتے تھے کہ حلف الفضول کے مطابق آج بھی میں تیار ہوں کہ مظلوم کو نجات دلائی جائے اور ظالم کا ہاتھ پکڑ لیا جائے اور اسے ظلم سے روک دیا جائے۔

جب خانہ کعبہ کی تعمیر ہورہی تھی اور حجر اسود کو اس کی جگہ پر نصب کرنے کے سلسلے میں اختلاف ہوگیا تھا، ہر قبیلے کی خواہش تھی کہ ہم اسے اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھیں، لوگوں نے فیصلہ کیا کہ صبح کو جو شخص بھی سب سے پہلے مسجد الحرام میں داخل ہوجائے گا وہ جو فیصلہ کرے گا، ہمیں قبول ہوگا۔ چنانچہ اللہ کی حکمت بالغہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے صبح کو مسجد الحرام کے اندر داخل ہوئے۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ آپ ہیں تو سب کے چہرے خوشی سے کھل گئے اور انہوں نے کہا کہ سبحان اللہ! یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، یہ امین ہے، یہ صادق ہے، ہمیں قبول ہے۔ گویا کہ یہ تو بہت ہی بہترین معاملہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا۔ خانہ کعبہ سے محبت ان مکہ والوں کو بے پناہ تھی وہ ان کے لئے عظمت کا ایک نشان تھا اور اس عظمت نشان یہ رکھوالے تھے، ان کی عزت کو چار چاند لگنے سے خانہ کعبہ کی بنیاد پر چار چاند لگتے تھے۔ اس سرخروئی اور سعادت کے حصول کے لئے ہر قبیلہ کہتا ہے کہ حجر اسود کی تنصیب کا شرف مجھے حاصل ہو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عجیب فیصلہ فرمایا کہ چادر بچھادی اور فرمایا کہ میں حجر اسود کو اٹھا کر اس چادر میں رکھوں گا، اس کے بعد مختلف قبائل کے سردار جو اس چادر کر پکڑ کر حجر اسود کے مقام تک لے چلیں گے، وہاں پھر میں اس کو اٹھا کر نصب کردوں گا۔ چنانچہ سب نے اس کو قبول کرلیا۔ سرور کائنات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل اور دانائی کے واقعات تو میں نے نبوت سے پہلے کے عرض کئے ہیں ورنہ تو ساری زندگی آپ کی ان عقل اور دانائی کے فیصلوں سے بھری پڑی ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کے نتیجے میں جس جماعت کی تشکیل فرمائی، وہ صحابہ کرام کی جماعت ہے، وہی صحابہ کرام کی جماعت دلیل ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس دعویٰ کے بعد ذکر فرمایا:

﴿والذین معه أشداء علی الکفار رحماء بینهم تراهم رکعا سجدا یبتغون فضلا من الله ورضوانا﴾ (الفتح: ۲۹) صحابہ کرام کا اتنا تفصیلی ذکر اسی لئے کیا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک ایک جملہ دلیل ہے۔ ﴿والذین معه﴾ ایک دلیل ہے آپ کی نبوت اور رسالت کی صداقت کی۔ ﴿أشداء علی الکفار﴾ یہ ایک اور دلیل ہے۔ ﴿رحماء بینهم﴾ ایک اور دلیل ہے۔ ﴿تراهم رکعا سجدا﴾ ایک اور دلیل ہے۔ ﴿یبتغون فضلا من الله و رضوانا﴾ ایک مستقل دلیل ہے۔ ﴿سیما هم في وجوههم من أثر السجود﴾ الگ دلیل ہے اور ہر دلیل میں سینکڑوں دلیلیں چھپی ہوئی ہیں۔

تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل وشواہد ہیں، آپ کی نبوت کے گواہ ہیں، اس اعتبار سے گویا ہم کہیں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سچی نبوت ہے، آپ کی رسالت سچی ہے۔ اس کے نتیجے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو نظام حیات عطا کیا۔ اس نظام حیات کے اندر روحانیت کی ترقی کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ اس نظام حیات میں تمام شعبہ ہائے زندگی کے اندر توازن کے طریقے تجویز فرمائے ہیں۔ اس نظام حیات میں سیاست کو متوازن رکھنے کے لئے اور دنیائے انسانیت کی راحت وآرام کے لئے طریقے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضع فرمائے ہیں۔ اس نظریہ حیات کے اندر سرور

کائنات جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا کو جنت نظیر بنانے کے لئے ہدایات دی ہیں۔ یہ تمام تعلیمات رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لئے مشعل راہ ہیں اوران کو اختیار کئے بغیر آدمی دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔

آپ دیکھ رہے ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا۔ تیرہ برس تک مکہ میں آپ پر انہوں نے ظلم کئے تھے اور آٹھ برس تک جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آ گئے تو ان کی زیادتی اور ظلم کی کوئی انتہا نہ تھی، پورے آٹھ سال کا زمانہ اس طرح گزرا کہ جیسے ایک مسلسل جنگ ہو، مسلسل تصادم ہو۔ اب مکہ فتح ہونے جارہا ہے اور وہی دشمن ہیں جنہوں نے ایذائیں پہنچاتے پہنچاتے اکیس سال گزار دیئے۔ آپ آج ان کے بدلہ لے سکتے تھے۔ مگر کیا ہوا؟ اکیس سال سے جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستایا، آپ کو قتل کرنے کے پروگرام بنائے اور صحابہؓ کو قتل کیا، آج آپ کو ان پر قابو مل رہا ہے تو آپ اعلان کرتے ہیں کہ آپ کا شہر دارالامن ہے، ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر کئے گئے تو وہ شرمندہ اور نادم ہیں اور اپنے کئے پر پچھتا رہے ہیں، گو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اشارہ ان کی گردن سے سر کو جدا کرنے کے لئے کافی ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اذھبوا، لاتثریب علیکم الیوم، أنتم الطلقاء! (تم سب آزاد ہو کوئی گرفت نہیں، کوئی مواخذہ نہیں۔)

جس کا دل چاہے ایمان قبول کرے، جس کا نہ چاہے نہ کرے اس کی مرضی ہے۔ چار ماہ کی مہلت ہے، اس کے بعد تم ایمان لے آئے تو ہمارے بھائی بن جاؤ گے اور ایمان نہ لائے تو مکہ پاک شہر ہے۔ چار ماہ کے بعد جہاں چاہو تم چلے جانا۔

آج حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کے عجیب مظاہرے آپ ہمارے شہر میں دیکھتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق کا خود ساختہ طریقہ اختیار کیا جارہا ہے۔ ان کا نہ نماز سے کوئی واسطہ، نہ دین سے کوئی تعلق، نہ سرور کائنات جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا کوئی تذکرہ۔ اس کی کوئی دعوت نہیں، اس کی طرف کوئی ترغیب نہیں۔ جھنڈے لگائے جارہے ہیں، عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا کیا جارہا ہے، بتیاں اور قمقمے لگائے جارہے ہیں۔ کیا اس طرح عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا کیا جاتا ہے؟ کس کو فریب دے رہے ہو بابا؟ یہ معاملہ تو تم بہت دن سے کرتے چلے آرہے ہو، زندگیوں میں کوئی انقلاب آیا نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کی وجہ سے اتنی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنی صورت ہی کو ان کی طرح بنا لیتے۔ اتنی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو سیکھنے کی کچھ کوشش کی جاتی، ایک سنت ہی معلوم کرلیں ایک دن کے اندر، چلو ایک ہفتے میں ایک معلوم کرلیں۔ یہاں تو عمر گزر گئی مگر ایک سنت کو زندہ کرنے کیلئے آپ کے دل میں داعیہ اور جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ افسوس کی بات ہے یہ طریقہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت اور عشق کے اظہار کرنے کا قابل قبول بھی نہیں ہے۔

دعا فرمائیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں سرور دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچی محبت، عشق اور ان کی تعلیمات کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین، ثم آمین)

☆

مدارس دینیہ......تاریخ ساز علمی ادارے

جامعہ فاروقیہ شجاع آباد ملتان میں منعقدہ تحفظ دینی مدارس کانفرنس سے حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا خطاب

ہم پاکستان بنانے والوں کی اولاد ہیں: ہم ملکی سلامتی کی وجہ سے بہت زیادہ خاموش ہیں۔ بولتے نہیں ہیں۔ ورنہ ہم نے بولا تو آپ کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ ہمیں ملک کا مفاد عزیز ہے۔ ہم نے اس ملک کے لئے خون دیا ہے اور آئندہ بھی دیں گے۔ ہم پاکستان بنانے والوں کی اولاد ہیں، اس پاکستان کا پہلا جھنڈا شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے لہرایا، قائداعظم مرحوم سے پوچھا گیا کہ آپ کے ساتھ پاکستان بنانے کی تحریک میں کوئی مولوی بھی ہے؟ قائداعظم نے جواب دیا، میرے ساتھ ایک ایسا عالم ہے کہ اگر پورے برصغیر کے علماء کا علم ایک پلڑے میں رکھا جائے اور اس کا علم ایک پلڑے میں رکھا جائے، اس اکیلے کے علم کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔ پوچھا گیا، قائداعظم وہ کون؟......کہا، مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ۔ یہ قائداعظم نے کہا۔ جب پہلی پرچم کشائی آئی ڈھاکہ میں اور کراچی میں، قائداعظم نے کہا، میں نہیں لہراؤں گا، یہاں علامہ شبیر احمد عثمانی اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانی جھنڈا لہرائیں گے، یہ دونوں ہمارے بزرگوں میں سے ہیں۔ یہ قائداعظم کا اقرار و اعلان تھا کہ اگر یہ علماء میرے ساتھ نہ ہوتے تو پاکستان نہ بنتا۔

پاکستان......ہمارا پیارا ملک: پاکستان کے پہلے آئین کی بنیاد، قرارداد مقاصد، تمام مکاتب فکر کے علماء نے مہیا کی ہے، پاکستان کو قبلہ آئین کے اعتبار سے ان علماء نے دیا ہے اور یہ قائداعظم کا اقرار ہے، میرے دادا حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ نے اس فتوے پر دستخط کئے تھے جو پاکستان کے قیام کی تحریک کا فتویٰ تھا اور انہوں نے اس قراردادِ مقاصد کو مرتب کیا تھا، جس کے لئے کراچی میں ہر مکتب فکر کی ٹیم اکٹھی ہوئی تھی اور انہوں نے پہلی دستور ساز اسمبلی کے لئے قراردادِ مقاصد تیار کی تھی، میرے دادا اس قراردادِ مقاصد کو مرتب کرنے والوں میں شامل ہیں۔ ہم پاکستان بنانے والوں کی اولاد ہیں، ہمیں یہ ملک عزیز ہے، کوئی اس ملک کا چاچا ماما، ملک کا ٹھیکیدار ہم سے زیادہ نہ بنے، کسی کو اپنی سیاست کے لئے، تجارت وصنعت کے لئے ملک عزیز ہوگا، مگر وہ بھی میری طرح بہت سارے ہوں گے، جو کہتے ہیں کہ سیاست تجارت بعد میں ہے، ملک پہلے ہے۔ ملک ہوگا تو

سیاست تجارت بھی ہے، صنعت بھی ہے، مدرسہ بھی ہے، مسجد بھی ہے، مولوی بھی ہے، اس لئے ہمیں سب سے زیادہ عزیز اپنا پاکستان ہے۔ اپنا ملک ہمیں پیارا ہے۔ ہم اپنے بچوں میں حب الوطنی کا جذبہ بھرتے ہیں اور میں نے کہا، خاکم بدہن، اگر پاکستان پر بُرا وقت آیا تو آپ کو یہ بچے اور طلباء فوج سے آگے نظر آئیں گے، پیچھے نہیں آئیں گے، انشاء اللہ یہ نظریاتی سرحدوں کے بھی محافظ ہیں، اور یہ جغرافیائی سرحدوں کے بھی محافظ ہیں۔

مدارس کی خدمات قابل ستائش ہیں: آج ہم نے آپ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا ہے، آپ سروے کرائیں کہ کسی تھانے میں، کسی مدرسے کے خلاف پورے سال میں کوئی پرچہ درج ہوا ہے؟ کوئی ایف آئی آر درج ہوئی ہے؟ اور پوچھیں اپنے تھانے سے کہ تم سب سے زیادہ پرسکون کن لوگوں سے ہو؟ آج تک انہوں نے بسوں کے ڈرائیوروں کے گریبان نہیں پکڑے، آج تک ان کے ہاتھ اپنے استادوں کے گریبان تک نہیں پہنچے، آج تک کسی مدرسے کو کھلوانے کے لئے کسی پولیس کو بلوانا نہیں پڑا، کراچی یونیورسٹی پر کتنا عرصے تک رینجرز اور پولیس کا پہرہ رہتا ہے، پھر تم اس مدرسے کے خلاف چڑھائی کیوں کرتے ہو؟ دن رات اس کو بدنام کیوں کرتے ہو؟ چاہئے تو یہ تھا کہ پوری قوم ان کو سلام کرتی کہ تم نے پاکستان کو قرآن کا حافظ دیا ہے، قرآن کا قاری دیا ہے، تم نے اس کو دین کا عالم دیا ہے، تم نے اس کو پاکستان کی حفاظت کے لئے جان دینے والا دیا ہے، تم نے یہاں ایک چھت کے نیچے سرائیکی، غیر سرائیکی، پنجابی، پٹھان، بلوچی کو پڑھا کر قومی وحدت کو فروغ دیا ہے، تم نے عورتوں میں تعلیم کو عام کیا ہے، تم نے غریبوں کے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا ہے، تم نے پچیس لاکھ کے کھانے پینے، روٹی، کپڑے، مکان کا خرچہ اٹھایا ہے، اور تم نے اپنی مدد آپ کے تحت اسلام کی روایات اور تہذیب کو برقرار رکھا ہے، تم مغربی دنیا کے ایجنڈے کے مقابلے میں کھڑے ہو، چاہئے تو یہ تھا کہ قوم ہمیں سلام کرتی مگر ہماری کردار کشی کی جارہی ہے۔

پاکستان کے اسلامی آئین کی حفاظت ضروری ہے: یاد رکھئے کہ اس وقت عالمی قوتوں کا ہدف پاکستان کا آئین ہے، پاکستان کے آئین کو وہ سیکولر بنانا چاہتے ہیں، اس کے آئین سے اسلام کو نکالنا چاہتے ہیں، اس کے آئین سے اسلامی دفعات کو نکالنا چاہتے ہیں، یہ آپ قومی نمائندوں کا سب سے زیادہ فرض ہے کہ آپ اسلام کا، جو اسلام آئین میں ہے، اس آئین کا تحفظ کریں اور سب سے بڑی ذمہ داری پیپلز پارٹی پر آتی ہے اور باقی تمام جماعتوں پر بھی یہ ذمہ داری آتی ہے، کیونکہ بھٹو کے دور میں یہ آئین ۷۳ء کا منظور ہوا تھا، بڑی محنت سے تمام پارٹیوں نے باہمی تعاون سے اس کو بنایا تھا۔

پاکستان اسلام کے لئے: آج یہ آواز اٹھ رہی ہیں کہ اس ملک کو سیکولر بنایا جائے، مذہب کا ریاست سے کیا تعلق ہے؟ اور اس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان نہیں، صرف جمہوریہ پاکستان ہونا چاہئے۔ اس کے آگے آپ کو اور مجھے بھی دیوار بننا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے لاکھوں لوگوں نے قربانیاں دی تھیں، اسلام کے لئے، پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ...... آج ہم جن لوگوں کو کہتے ہیں کہ اسلام کے لئے ہتھیار نہ اٹھاؤ، اسلام کے لئے مسلح جدوجہد نہ کرو، قانون ہاتھ میں نہ لو تو ہماری دلیل یہ ہوتی ہے کہ یہ حکمران غلط ہوسکتے ہیں مگر پاکستان کا آئین غلط نہیں ہے۔ آئین اسلامی ہے اگرچہ حکمرانوں نے اس کو نافذ نہیں کیا۔ اس

لئے تم حکمرانوں کے خلاف اگر اٹھو گے یہ ریاست کے خلاف ہوگا، ہم آئینی جدوجہد، پرامن جدوجہد کے ذریعے اسلامی نظام کو لائیں گے، ہم کسی مسلح جدوجہد کی حمایت نہیں کریں گے، کیونکہ پاکستان کا آئین اس ملک میں اسلام کی بالادستی کا آئین بنتا ہے۔ پاکستان کا آئین ہدف ہے اور پاکستان کا ایٹمی پروگرام دشمنوں کا ہدف ہے۔ اس کا ایٹم بم ان کی نظر میں ہے، اس لئے کہ واحد اسلامی ملک ہے۔

دشمنوں کا ہدف پاکستان کا ایٹم بم: میں نے پرسوں وزیراعظم کی موجودگی میں اسلام آباد میں کہا کہ پاکستان کا امن واستحکام صرف سترہ کروڑ پاکستانیوں کی ضرورت ہی نہیں ہے، پچیس سے تیس کروڑ ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی ضرورت ہے اور پورے عالم اسلام کی بھی ضرورت ہے کیونکہ میں کئی ملکوں میں گیا ہوں، میں ایک دن مراکش میں تھا، وہاں کے کنگ کی دعوت پر پوری دنیا کے مسلمان مفکر دانشور آئے تھے، میرا تعارف ہوتا، میں پاکستانی ہوں، وہ فوراً پاکستان کے لئے دعائیں کرتے اور مجھے مصر کے ایک سابق وزیر نے کہا، ہم جتنا مصر کا استحکام چاہتے ہیں، اتنا پاکستان کا استحکام چاہتے ہیں، ہم میں سے کسی کے پاس ایٹم بم نہیں ہے، پاکستان کے پاس ایٹم بم ہے۔ یہ پوری امت مسلمہ کی امانت ہے۔ یہ ایٹم بم پاکستان کا عالمی قوتوں کا نشانہ اور ہدف ہے اور تیسرا پاکستان کی جذبے سے جوان، بھرپور فوج جو دشمنوں کا ہدف ہے، اتنی مضبوط فوج کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہی جذبے والی فوج جو جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر لڑتی ہے۔

جہاد کی تعلیم اور ٹریننگ: ضمناً بات آئی، وقت زیادہ ہوگیا، میں بات بھی ختم کرتا ہوں، ایک دفعہ باہر کی پریس کا ایک نمائندہ آیا، مجھ سے بڑا لمبا انٹرویو کیا، مجھے بار بار کہے، مولانا آپ مدرسے میں جہاد کی تعلیم دیتے ہیں؟ میں نے کہا، دیتے ہیں۔ تو کہتا ہے کہ اگر حکومت سے کہے کہ آپ اپنے مدرسوں میں جہاد کی تعلیم نہ دیں تو آپ مان لیں گے؟ میں نے کہا، حکومت سے ہمارے مذاکرات دن رات چل رہے ہیں، آج تک انہوں نے کبھی ہم سے نہیں کہا۔ کہنے لگا، اگر اب کہیں؟ میں نے کہا، آپ نے مشورہ دیا ہے......؟؟ خاموش ہوگیا۔ میں نے کہا کہ ہمیں آج تک حکومت نے نہیں کہا کہ آپ مدرسے میں جہاد نہ پڑھائیں اور حکومت کیسے کہے گی، صرف ہم نہیں پڑھاتے، یہ تو اسکولوں میں بھی پڑھایا جاتا ہے۔ جہاد کا سبق اور اس کا چیپٹر تو اسکول اور کالج کی تعلیم میں بھی موجود ہے۔ سورۃ ممتحنہ، سورۃ توبہ نصاب میں شامل ہیں، وہاں بھی جہاد کے احکامات آتے ہیں۔ پھر بار بار مجھ سے کہے، تو میں نے اس کو کہا، اس زمانے میں پرویز مشرف پریزیڈنٹ تھے، میں نے کہا، یار بات سنو، ہم جہاد کی تعلیم دیتے ہیں، تھیوری پڑھاتے ہیں، جہاد کی ٹریننگ نہیں دیتے، اور جہاد کی تعلیم بطور علم، بطور تحقیق یہ کوئی بری بات نہیں۔ اگر تمہاری یونیورسٹیوں میں ایٹم بم بنانے کا طریقہ پڑھایا جاتا ہے، آپ کہیں گے کہ آپ دہشت گردی کی تعلیم دے رہے ہیں؟ آپ کہیں گے...... یہ تو تھیوری ہے، ایک علم ہے، یک نالج ہے، یہ تو آنا چاہئے۔ میں نے کہا، جس طرح دنیا کے ادارے ایٹم بم بنانے کے طریقے پڑھائیں وہ غلط نہیں، اگر ہم جہاد کی تعلیم دیں تو وہ بھی غلط نہیں۔ ہم تھیوری پڑھاتے ہیں جہاد کی ٹریننگ نہیں دیتے۔ پرویز مشرف آپ کے دوست ہیں؟ کہتا ہے ہاں، امریکہ کے دوست ہیں۔ میں نے کہا، پرویز مشرف کو امریکا اپنا دوست سمجھتا ہے۔ مدرسوں

والے مولوی تو صرف جہاد پڑھاتے ہیں، پرویز مشرف تو جہاد کی ٹریننگ دیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے وہ کیسے؟......میں نے کہا، ہر فوجی چھاؤنی پر لکھا ہوا ہے۔ ''ایمان، تقویٰ، جہاد فی سبیل اللہ'' ......اور وہ فوج کے سربراہ ہیں اور یہ فوج کا ماٹو ہے۔ ظاہر ہے کہ چھاؤنی کے اندر جہاد کی ٹریننگ ہوگی، تبھی تو باہر لکھا ہوا ہے تو اگر وہ جہاد کی ٹریننگ دینے کے باوجود دہشت گرد نہیں ہیں تو ہم جہاد کی تعلیم دے کر دہشت گرد کیسے بن گئے؟

جہاد......اللہ کا حکم ہے!: اور یہ تعلیم بھی ہم اس لئے دیتے ہیں کہ ہمارے قرآن کا حکم ہے۔ تم جہاد کا مطلب سمجھو، جہاد کا معنی، کسی بے گناہ کو مارنا نہیں ہے۔ جہاد بڑے وسیع مفہوم میں ہے اور اس کی بڑی شرائط ہیں، بڑی حدود وقیود ہیں، جس معنی میں تم جہاد لیتے ہو وہ جہاد نہیں ہے، ہم جس معنی میں پڑھاتے ہیں وہ تو امن اور پیس کا ہے۔ وہ تو یہ کہتا ہے تمہاری دشمن سے لڑائی ہو تو، اس وقت بھی دشمن کی عورتوں کو نہ مرو، ان کی شہری آبادی پر حملہ اور اٹیک نہ کرو، ان کے بوڑھوں کو نہ مارو، ان کے بچوں کو نہ مارو، جنگ سے لاتعلق لوگوں کو کچھ نہ کہو اور سول آبادی کو نشانہ نہ بناؤ اور کسی مذہب کی عبادت گاہ کو نشانہ نہ بناؤ، یہ دین تو جنگ میں بھی پیس کی تعلیم دیتا ہے، دنیا میں کہیں بھی ایسا نہیں ہے۔ جہاد کی تعلیم تو ہم دیتے ہیں اور انشاء اللہ دیتے رہیں گے، کیونکہ یہ قرآن کا حصہ ہے اور میں نے اس سے کہا کہ ہمارا یہ یقین وایمان ہے کہ قرآن کے کسی حکم کو اور اللہ کے حکم کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بدل سکتے تو ہم کہاں بدل سکتے ہیں؟ کیوں بھئی کوئی بدل سکتا ہے اللہ کے حکم کو؟ جب اللہ نے قرآن میں جہاد کی آیتیں اتاری ہیں تو اس کا کون انکار کرسکتا ہے؟ البتہ اس کا انطباق، اس کا مفہوم، اس کی تعریف وہ نہیں ہے جس طرح آج دنیا میں پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، جو صحیح معنی میں جہاد ہے، وہ اللہ کا حکم ہے، ہم اس کی تعلیم دیتے تھے، دیتے ہیں اور دیتے رہیں گے۔

میں آپ حضرات کا پھر شکر گزار ہوں آپ تشریف لائے، میں نے مدارس کا مقدمہ آپ کے سامنے پیش کیا، اس کے نصاب تعلیم، نظام تعلیم کو آپ کے سامنے رکھا، اس کے نصاب تعلیم میں دینی تعلیم بھی ہے، میٹرک تک عصری تعلیم بھی ہے، کمپیوٹر کی تعلیم بھی ہے، اب ہم نے مدرسے میں فنی تعلیم دینا بھی شروع کی ہے......ایجوکیشن بھی ہم دے رہے ہیں۔

مدارس کا مقصد: ہمارا مقصد دراصل ڈاکٹر بنانا، انجینئر بنانا، سائنسدان بنانا ہے ہی نہیں۔ آج تک میڈیکل، یونیورسٹی سے یہ نہیں کہا گیا کہ تم نے کوئی سائنسدان کیوں تیار نہیں کیا، کسی لاء کالج کو یہ نہیں کہا گیا کہ تم نے آج تک انجینئر کیوں نہیں پیدا کیا، کیونکہ ان کا مقصد ہی الگ ہے۔ ہمارا مقصد بھی دینی علوم کا ماہر پیدا کرنا ہے۔ مدرسوں کا مقصد ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان بنانا ہے ہی نہیں، ہاں عصری تعلیم میٹرک ہے، تاکہ آج کے حالات سے واقفیت ہو، اس سے ہمیں انکار نہیں ہے، ہم دے رہے ہیں، مزید انشاء اللہ آگے دیں گے۔

مدارس کی حمایت میں آواز اٹھائیں: اللہ تعالیٰ آپ کا آنا مبارک فرمائیں۔ میں فرداً فرداً آپ حضرات کا، منتظمین کا، میزبانوں کا اور تمام مہمانوں کا شکر گزار ہوں، آپ تو بے پناہ مصروف ہوتے ہیں، ہماری درخواست پر آئے ہیں۔ آپ مدرسوں کو اپنا ادارہ سمجھیں، مدرسوں کے لئے آپ کو آواز اٹھانی چاہئے، آپ کی آواز میں طاقت ہماری آواز سے زیادہ ہے۔ ہم فریق ہیں اور آپ ہوں گے تو غیر جانبدارانہ رائے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کا آنا مبارک فرمائے۔ وما علینا الا البلاغ

علماء کرام کی المناک شہادت

ادارہ

حضرت مولانا مفتی سعید احمد جلال پوری، حضرت مولانا عبدالغفور ندیم اور دیگر علماء کرام کی شہادت:

ملک کے ممتاز ترین دینی ادارہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی سے شائع ہونے والے مشہور ماہنامہ ''بینات'' کے مدیر اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے رہنما حضرت مولانا مفتی سعید احمد جلال پوری، ان کے فرزند ارجمند مولانا حذیفہ جلال پوری اور مفتی عبدالرحمٰن اور مفتی فخر الزمان رحمہم اللہ تعالیٰ کو ملک وملت کے دشمن دہشت گردوں نے 11 مارچ 2010ء بروز جمعرات فائرنگ کر کے شہید کر دیا۔ جبکہ اسی روز دہشت گردوں نے فائرنگ کر کے اہلسنت والجماعت پاکستان کے مرکزی سیکریٹری اطلاعات حضرت مولانا عبدالغفور ندیم کو زخمی اور ان کے صاحبزادے کو شہید کر دیا۔ حضرت مولانا عبدالغفور ندیم صاحب بھی چند دن اسپتال میں رہنے کے بعد خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے۔ دین کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے ان علماء کرام کی المناک وافسوسناک شہادت نے جہاں مسلمانوں کو غمزدہ کر دیا وہاں پاکستان کے تخت وتاج پر بیٹھنے والے اصحاب اقتدار کے منہ پر زبردست طمانچہ ہے۔ ان پاکباز علماء کرام کا کیا قصور تھا جن کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ دین دشمن عناصر اگر یہ سمجھتے ہوں کہ ان علماء کرام کی شہادت سے دین اسلام ختم ہو جائے گا اور ان ختم نبوت وعظمت صحابہ کرام کے دفاع کرنے والے شیدائی اپنا مشن چھوڑ دیں گے تو یہ ان کی بھول ہوگی۔ بلکہ شہادت قافلۂ حق وصداقت کا شعار رہی ہے اور جہاں گلشن اسلام کو خون سے آبیاری کی ضرورت پڑی ہے تو تاجدار ختم نبوت اور یاران باوفاء کی عظمت پر فدا ہونے والے شیدائی ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔

ادارۂ ماہنامہ ''وفاق المدارس'' کے مدیر اور دیگر جملہ کارکنان، شہداء کرام کے غم میں برابر کے شریک اور ان کے لئے دست بدعاء ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پاکباز علماء کرام کی شہادتوں کو قبولیت عطا فرما کر جنت الفردوس میں جگہ عطاء فرمائیں اور پسماندگان اور تمام عقیدتمندوں، ارادتمندوں کو صبر جمیل واجر جزیل سے نوازیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تحفظ مدارسِ دینیہ کنونشن لیہ و کہروڑپکا رپورٹ

مرتب: مولانا زبیر احمد صدیقی
مسئول وفاق المدارس العربیہ پاکستان جنوبی ملتان
مدیر جامعہ فاروقیہ شجاع آباد (ملتان)

مورخہ ۴؍فروری ۲۰۱۰ء کو جامعہ فاروقیہ شجاع آباد ملتان میں انعقاد پذیر تحفظ و خدمات مدارس دینیہ کنونشن کہنے کو تو ضلع ملتان کے مدارس کا کنونشن تھا لیکن حقیقت میں یہ جنوبی پنجاب کے ڈویژن ملتان، بہاولپور اور ڈی جی خان کے تقریباً تمام اضلاع کے مرکزی مدارس کے مندوبین اور تاجران، صحافیان، ناظمین، وکلاء، سیاسی قائدین پر مشتمل ایک ہمہ گیر کنونشن تھا۔ یہ کنونشن مدارس کے باہمی رابطہ کے علاوہ، تحفظ مدارس کی تحریک کا نقطۂ آغاز اور دیگر اضلاع کے مدارس کو اپنے اپنے مسائل کے حل کے لئے ایک پلیٹ فارم کی فراہمی کا ذریعہ ثابت ہوا۔

چنانچہ مختلف اضلاع کے مدارس نے اس طرح کے کنونشنز منعقد کرنے کے فیصلے کئے۔

شجاع آباد کے کنونشن کے بعد سب سے پہلے مدرسہ اشرف المدارس لیہ میں ضلع لیہ اور گردونواح کے مدارس کا کنونشن منعقد ہوا، لیہ اور بھکر صوبہ سرحد کے قریبی اضلاع ہیں لیکن لیہ میں ضلعی انتظامیہ نے یہاں کے مدارس کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک رکھا ہوا ہے۔ مدارس کے ساتھ یہ امتیازی رویہ ملک بھر کے کسی ضلع میں، کسی دینی یا عصری تعلیمی ادارہ کے ساتھ روا نہیں رکھا جارہا۔

یہاں کی انتظامیہ نے مدارس اور مساجد کی تعمیر پر مکمل پابندی لگائی ہوئی ہے۔ ضلع بھر میں کہیں مسجد کی تعمیر کی کوشش کی گئی تو متعلقہ ذمہ دار کے خلاف ایف آئی آر درج کر کے ہراساں کیا گیا، کسی مدرسہ کی دیوار گرگئی، ذمہ داران مدرسہ نے دیوار کی تعمیر نو شروع کی تو انہیں بھی مقدمہ کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ ایک مدرسہ میں پانی کی ٹینکی کی تعمیر شروع ہوئی تو فوراً ضلع لیہ کا امتیازی کالا قانون حرکت میں آیا اور مقدمہ درج ہوگیا۔

علاوہ ازیں یہاں کی انتظامیہ نے ضلع لیہ کے ہر مدرسہ میں روزمرہ پڑتال کا سرکاری رجسٹر رکھوایا ہوا ہے جس میں اساتذہ، طلباء اور عملہ کے نام درج ہیں۔ مدارس کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ صبح شام ان رجسٹروں کو پُر کریں اور خفیہ ایجنسیوں کے اہلکار وقت بے وقت آ کر ان رجسٹروں کو چیک کرنے کے بہانے دراندازی کرتے ہوئے مدارس کے اساتذہ و طلباء کو ہراساں کرتے رہتے ہیں۔

ان حالات میں ضلع لیہ کے مدارس نے اپنے علاقہ کے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے مسئول اور رکن عاملہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید فاروقی صاحب سے رابطہ کر کے حضرت اقدس مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے مشورہ سے مورخہ ۴؍مارچ ۲۰۱۰ء کو مدرسہ اشرف المدارس لیہ میں مدارس کے خلاف حرکت میں آنے والے اس کالے قانون کے خاتمہ کے لئے بھرپور کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔

تحفظ مدارسِ دینیہ و پیغامِ امن کنونشن لیہ کی کامیابی کے لئے حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالمجید فاروقی کی سرپرستی میں قاری محمد رمضان، قاری محمد حیات تونسوی، قاری عبدالغفور رحیمی، مولانا غلام اکبر، مولانا عبداللہ، مولانا عبدالرحمٰن، قاری محمد ایوب طاہر، مولانا غلام مصطفیٰ، حافظ محمد علی، قاری اللہ نواز سرگانی، ماسٹر محمد شفیق، مفتی ضیاء الحق سرگرم عمل رہے۔

مورخہ ۴؍مارچ ۲۰۱۰ء کو راقم الحروف منتظمین کنونشن کی دعوت پر حضرت ناظم اعلیٰ صاحب دامت برکاتہم کی معیت میں لیہ روانہ ہوا۔ ان دنوں حضرت ناظم اعلیٰ کمر کے درد کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ چنانچہ انہیں ڈاکٹروں نے فزیوتھراپی کے علاوہ بیڈ ریسٹ کا مشورہ دیا تھا۔ حضرت ناظم اعلیٰ اپنی علالت کے باوجود اپنی گاڑی میں لیٹ کر اس کنونشن میں شرکت کے لئے روانہ

ہوئے۔ جامعہ اشرف الاسلام چوک سرور شہید میں حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالمجید فاروقی صاحب کی قیادت میں علماء کرام اور مشائخ عظام استقبال کے لئے جمع تھے۔ یہاں مختصر قیام کے بعد مقامی مشائخ اور علماء کرام حضرت ناظم اعلیٰ صاحب کو قافلہ کی صورت میں لیہ لے گئے۔ پروگرام کے تحت علماء کرام نے حضرت ناظم اعلیٰ کی قیادت میں مقامی D.C.O اور D.P.O سے ملاقات کرنا تھی چنانچہ قافلہ سیدھا ڈی سی او آفس پہنچا، جہاں پر ڈی پی او لیہ بھی مذاکرات کے لئے تشریف لے آئے۔

حضرت ناظم اعلیٰ صاحب نے ضلع لیہ کی انتظامیہ کو اس امتیازی قانون کے مقاصد سے آگاہ کیا اور فی الفور اس قانون کو ختم کرنے اور اہلِ مدارس کے خلاف قائم کیے گئے مقدمات کی واپسی کا پُرزور مطالبہ کیا۔ انہوں نے انتظامیہ پر واضح کیا کہ یہاں ایک ایسے قانون کو جاری کیا گیا ہے جو ملک کے کسی بھی ضلع میں رائج نہیں جس کا خاتمہ بہر صورت ضروری ہے۔ وفد کے شرکاء میں مولانا عبدالمجید فاروقی، مولانا محمد اقبال، مولانا سیف الرحمٰن، مولانا عبدالرشید، مولانا عبدالرحمٰن، قاری عبدالغفور، قاری اللہ بخش وغیرہ شامل تھے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے مذاکرات کے بعد قافلہ کنونشن کے لیے روانہ ہوا۔ مدرسہ اشرف المدارس میں کنونشن کی کاروائی شروع ہو چکی تھی۔ نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد ہم سب سٹیج پر پہنچے۔

پنڈال کھچا کھچ بھر چکا تھا، یہ اجتماع لیہ کی تاریخ کا فقید المثال اجتماع تھا جس میں علماء کرام یکجان نظر آ رہے تھے۔ علاوہ ازیں مقامی سیاسی قائدین، ناظمین، وکلاء، تاجر اور صحافی بھی کثیر تعداد میں شریک تھے۔ کنونشن سے حضرت مولانا مفتی عبدالجلیل صاحب خطاب فرما رہے تھے۔ ان سے قبل حضرت مولانا صاحبزادہ محمد عمر قریشی مدظلہٗ، مولانا محب اللہ، مفتی حفیظ اللہ، مفتی خالد محمود مسئول وفاق حضرت مولانا مفتی محمد صدیق صاحب محمود کوٹ، مولانا صفی اللہ صاحب بھکر، مولانا عبدالمجید توحیدی اور مولانا قاری محمد حیات تونسوی خطاب فرما چکے تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالمجید فاروقی مدظلہٗ نے مختصر خطاب میں کنونشن کی غرض وغایت بیان کی اور مہمانان گرامی بالخصوص حضرت ناظم اعلیٰ صاحب مدظلہٗ اور راقم الحروف کا شکریہ ادا کیا، اس کے بعد راقم الحروف کو دعوتِ سخن دی گئی۔ راقم الحروف نے اپنے مختصر بیان میں مدارس کی تاریخ اور خدمات پر روشنی ڈالی، بعدہٗ جمعیت علماء اسلام کے سرپرست حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب مدظلہٗ العالی آف بھکر کو دعوتِ خطاب دی گئی۔ حضرت نے نہایت ہی شاندار اور مختصر خطاب فرمایا اور جمعیت کی طرف سے وفاق المدارس کی قیادت پر بھرپور اعتماد کا اظہار فرمایا۔

آخر میں سالار قافلہ اور تحریک تحفظ مدارس دینیہ کے محرک حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب مدظلہٗ ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کو دعوتِ خطاب دی گئی۔ حضرت نے ایک گھنٹہ سے زائد مدارس کی خدمات اور افادیت پر بھرپور خطاب فرمایا۔ انہوں نے مدارس پر لگائے جانے والے اعتراضات کے بھی مسکت اور مدلل جوابات ارشاد فرمائے۔ انہوں نے اپنے خطاب میں ضلع لیہ میں جاری کیے گئے امتیازی قانون کی بھرپور مذمت کی، اور فرمایا کہ مساجد مدارس میں حکومتی مداخلت کا منہ توڑ جواب دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ مدارس اور مساجد ہماری دینی جائیدادیں ہیں، جس طرح اپنی جائیداد کی حفاظت ہر حال میں کی جاتی ہے اس طرح مدارس ومساجد کی حفاظت کریں گے۔ آج دنیا میں اگر اسلام باقی ہے تو علم دین کی وجہ سے اور علم مدرسہ کی وجہ سے باقی ہے۔ ڈاکٹری، انجینئرنگ، سائنس، وکالت، صحافت فنون ہیں اور "علم" قرآن وحدیث کے علم کو کہتے ہیں۔ پہلے مسلمان حکومتیں مدارس میں قرآن وحدیث کے علم کے ساتھ علم جغرافیہ سائنس، طب، انجینئرنگ کا اہتمام کرتی تھی مگر برصغیر میں جب کالج یونیورسٹی سے دینی علم کو نکالا گیا تو تفریق پیدا ہوگئی۔

مدارس ملک کی بہت بڑی این جی او ہیں جو حکومتی تعاون کے بغیر کام کر رہے ہیں۔ جس طرح کالج، یونیورسٹیاں، ڈاکٹرز، انجینئرز، سائنس دان، وکیل پیدا کرتی ہیں اور یہ ملک کی ضرورت ہے اسی طرح مدارس حافظ، عالم، قاری اور امام پیدا کرتے ہیں جو ملک کی اسلامی ضرورت ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے تو تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اور کالجز سکول میں دینی تعلیم لازمی کی جائے جس طرح سے اپنے گھر، مکان، دکان سے ہماری ضرورتیں وابستہ ہیں اسی طرح مسجد مدرسہ سے ہمارا کلمہ دین، ایمان اسلام وابستہ ہے، اس لئے ان کی حفاظت کی بھی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ملک کی سلامتی، ثقافت، بقاء، رواداری، روایت کے ضامن ہیں۔ مدارس ملک میں شرح لٹریسی میں اضافہ کرنے میں

مصروف ہیں۔ ۲۵ لاکھ طلباء وطالبات کی تعلیم، علاج، کفالت، کھانا، رہائش اور کتب مفت فراہم کرنے کے علاوہ ان کے لئے 81ہزار معاون اساتذہ عملہ مصروف ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت مدارس کو کنٹرول کر کے تعلیمی نظام تباہ کرنا چاہتی ہے۔ جس طرح حکومت کے اپنے ادارے تباہ اور سکول ناکام ہو چکے ہیں کہ لوگ پرائیویٹ تعلیم کو ترجیح دے رہے ہیں، انہوں نے کہا کہ تعلیم تجارت بن چکی ہے۔ مدارس میں تعلیم دی جاتی ہے بیچی نہیں جاتی۔

اس کنونشن میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے مرکزی دفتر سے ناظم دفتر حضرت مولانا عبدالمجید صاحب اور محاسب جناب چوہدری محمد ریاض شاہد صاحب نے بھی خصوصی طور پر شرکت کی۔

بعدہٗ حضرت ناظم اعلیٰ صاحب مدظلہٗ پریس کانفرنس کے لیے سیلیبریشن ریسٹورنٹ تشریف لائے، راقم الحروف اور شیخ الحدیث مولانا عبدالمجید فاروقی بھی ہمراہ تھے، وہاں حضرت نے ایک پرہجوم پریس کانفرنس فرمائی، انہوں نے فرمایا کہ حکومت نے مدارس دینیہ کے ساتھ امتیازی رویہ رکھا ہوا ہے جبکہ مدارس دینیہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے امین ہیں، امن و آشتی کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں، مدارس ہماری جائیداد اور میراث ہیں، ہمارا دین اسلام کلمہ نماز، قرآن مسجد ہماری دنیا و آخرت میں کامیابی کی کنجی ہیں۔ تو مدارس کا رشتہ ان سب سے گہرا ہے۔ مدارس پر دہشت گردی کا الزام لگانا تو آسان ہے مگر اسے ثابت آج تک نہیں کیا جاسکا، ملک پاکستان میں تعلیم ایک صنعت بن چکی ہے اور اسے بیچا جا رہا ہے جبکہ مدارس میں تعلیم دی جاتی ہے بیچی نہیں جاتی۔ مدارس عربیہ ملک بھر میں ۲۵ لاکھ طلباء وطالبات کے کفیل، مفت تعلیم، علاج معالجہ، رہائش، خوراک کے ذمہ دار ہیں۔ عوام الناس کی اکثریت حکومتی سکولوں اور کالجز پہ اعتماد نہیں رکھتی، یہی وجہ ہے کہ تعلیمی میدان میں پرائیویٹ سیکٹر کامیاب ہو رہا ہے، حکومت اپنے ادارے تو کنٹرول نہیں کر سکتی لیکن مدارس کو کنٹرول کرنا چاہتی ہے۔ مدارس کی خودمختاری اور سالمیت پر سودے بازی نہیں کریں گے۔ مدارس مساجد کی تعمیر پر این او سی لینے کی پابندی غیر آئینی اور ۱۸۶۰ء کے سوسائٹی ایکٹ کے صریحاً خلاف ہے۔ مدارس بارے حکومت غیر آئینی اقدام سے گریز کرے، ہم کسی صورت پابندی برداشت نہیں کریں گے۔ ملک کی حفاظت کیلئے ہمیشہ علماء نے ہراول دستہ بن کر دکھایا، آئندہ بھی ملک کو ضرورت پڑی تو ہم قربانی دیں گے مگر اپنے مشن قرآن وحدیث کی تعلیم سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ضلع لیہ میں مدارس مساجد کی تعمیر پر قائم مقدمات خارج کئے جائیں۔

اس کنونشن کی کوریج کے لئے صحافی عبدالرؤف نفیسی اور عمر فاروق سرگانی کی خدمات قابلِ رشک تھیں۔

....

ضلع لودھراں کے جامعات و مدارس کا کنونشن

مورخہ ۱۰ ارمارچ ۲۰۱۰ء بروز بدھ ضلع لودھراں کے جامعات و مدارس کا کنونشن طے ہوا۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان ضلع لودھراں کے فیصلہ کے مطابق یہ کنونشن جنوبی پنجاب کے ممتاز دینی ادارہ جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا میں نمائندہ مسئول ضلع لودھراں، وہاڑی، پاکپتن حضرت مولانا مفتی محمد ظفر اقبال صاحب کی زیرنگرانی اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے رکن عاملہ اور شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی دامت برکاتہم کی صدارت میں ہونا طے پایا۔

مفتی ظفر اقبال صاحب ماشاءاللہ نہایت متواضع، باسلیقہ اور انتھک عالمِ دین ہیں۔ انہوں نے اس کنونشن کی کامیابی کے لئے شب و روز محنت کی۔ ضلع لودھراں کے علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دے کر انہوں نے اپنی ورک ٹیم بنالی۔ اس کمیٹی میں جامعہ سراج العلوم لودھراں سے مولانا محمد میاں صاحب مدظلہٗ، جامعہ مفتاح العلوم کہروڑ پکا سے مولانا محمد شریف، جامعہ اسلامیہ دارالقرآن کہروڑ پکا سے مفتی محمد اسماعیل، جامعہ سراجیہ لودھراں کے مولانا ضیاء اللہ، مدرسہ علی المرتضیٰ دنیا پور کے مولانا حفظ الرحمٰن اور کہروڑ پکا سے حضرت مولانا غلام محمد شامل تھے۔ مولانا مفتی محمد ظفر اقبال صاحب ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا نے اپنی ٹیم کے ساتھ ضلع بھر کے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے افراد سے ملاقاتیں کر کے کنونشن کی بھرپور دعوت دی۔

راقم الحروف سے بھی موصوف رابطہ میں رہے اور احقر نے بھی مقدور بھر اس کنونشن کی کامیابی کے لئے اپنا حصہ ڈالا۔ ان علماء کرام کی محنت سے ۱۰ ارمارچ سے قبل ضلع لودھراں کے ہر شہر اور قصبہ میں تاجروں کی مختلف تنظیموں، اہلِ مدارس اور دیگر سول سوسائٹی کی جانب سے مدارس کے حق میں بینرز آویزاں کرا دیے گئے۔ راقم الحروف اس کنونشن میں شرکت کے لئے

ایک روز قبل یعنی ۹ ر مارچ ۲۰۱۰ء کو ہی کہروڑ پکا پہنچ گیا تھا۔ احقر نے مفتی ظفر اقبال صاحب اور شہر کی مختلف تنظیموں کے نمائندوں کے ساتھ پریس کانفرنس کی۔ رات بھر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کے اساتذہ وطلباء کنونشن کی رابطہ کمیٹی کے علماء کرام کے ہمراہ کنونشن کے انتظامات میں مصروف رہے۔ اگلے روز ۱۰ ر مارچ بروز بدھ کنونشن کی پہلی نشست کا صبح ۱۰ بجے کے بعد آغاز ہوا۔ کنونشن کی یہ نشست صرف اہلِ مدارس پر مشتمل تھی۔ نشست کی غرض وغایت، ذمہ دارانِ مدارس کا باہمی ربط وتعارف اوران کی مشکلات سے آگاہی تھا۔ اس اجلاس کی صدارت جامعہ اسلامیہ باب العلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی صاحب مدظلہٗ نے فرمائی۔ اس اجلاس میں ضلع لودھراں کے علاوہ دیگر اضلاع سے اہلِ علم، شیوخ الحدیث خصوصی طور پر شریک ہوئے۔ اجلاس میں امام الاولیاء، شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری نوّر اللہ مرقدہٗ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا زاہد الحسینی رحمہ اللہ کے خلف الرشید حضرت مولانا ارشد الحسینی مدظلہٗ کے علاوہ جامعہ خالد بن ولید وہاڑی سے حضرت مولانا محمد ظفر قاسم، جامعہ دارالعلوم رحیمیہ ملتان سے حضرت مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری اور شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن جامی بمعہ دیگر اساتذہ کرام، جامعہ قادریہ حنفیہ ملتان سے شیخ الحدیث مولانا محمد نواز، جامعہ اسعد بن زرارہؓ بہاولپور سے حضرت مولانا مفتی محمد مظہر اسعدی، جامعہ حنفیہ بورے والا سے مولانا قاری محمد طیب حنفی، تبلیغی جماعت کے بزرگ حافظ عبدالصمد صاحب، فاضل دیوبند حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب، جامعہ باب العلوم سے الحاج غلام محمد عباسی، ڈاکٹر محمد یٰسین، نائب شیخ مولانا حبیب احمد صاحب اور جامعہ فاروقیہ شجاع آباد سے احقر اور مفتی محمد طیب معاویہ کے علاوہ دوسو سے زائد مدارس کے نمائندوں نے شرکت فرمائی۔ اجلاس میں تعارف کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالمجید لدھیانوی مدظلہٗ نے شرکاء مجلس کی تشریف آوری کے شکریہ کے بعد اہلِ علم کو خدمتِ دین کی نعمت پر شکرِ الٰہی کی ترغیب دی اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو نعمتِ عظمیٰ قرار دیا، انہوں نے فرمایا کہ علماء اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہیں اس لئے علماء کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہئے۔ علماء کو چاہئے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو صحیح معنوں میں نبھائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ۔

آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا ۔۔۔ تلواروں کے سائے میں پل کر جواں ہوئے ہم

انہوں نے فرمایا کہ ہم اکابر کے سائے میں پل کر جوان ہوئے ہیں، ان شاء اللہ ہمارا قافلہ رکنے اور تھمنے والا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ سکندر مرزا جیسے "علماء کو کشتی پر سوار کر کے ملک بدر کرنے" کے دعویدار اور پرویز مشرف جیسے اتاترک کو آئیڈیل کہنے والے، آج ملک میں نہیں مدارس اور علماء موجود ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ منافقینِ مدینہ نے حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ذلیل قرار دے کر نکالنے کی دھمکی دی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عزت دی، اسی طرح منافقین نے مسلمانوں پر خرچہ بند کرنے کی دھمکی دی تھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب خزانے اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ یہی دونوں باتیں آج کے منافقین مدارس کے بارے میں کر رہے ہیں۔ وہ علماء کو ذلیل بھی قرار دیتے ہیں اور چندے بند کرنے کی دھمکی بھی دیتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب کی تقریر کے دوران ناظم اعلیٰ وفاق المدارس پاکستان حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری مدظلہٗ بھی تشریف لے آئے۔ اجلاس میں سٹیج پر ایک نشست حضرت ناظم اعلیٰ صاحب، دوسری نشست صدرِ اجلاس حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہٗ اور تیسری نشست اجلاس کی کاروائی چلانے کے لیے راقم الحروف کے لیے بنائی گئی تھی۔ جہاں الگ الگ مائیک نصب کیے گئے اور شرکاء اجلاس کے لئے کارڈلیس مائیک کا انتظام کیا گیا تھا۔

اب آراء کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولانا سعید احمد شاہ کاظمی، مفتی محمد طیب معاویہ، قاری محمد اکرم اور مولانا مفتی محمد مظہر اسعدی صاحب سمیت کئی ایک علماء کرام نے زبانی اور تحریری آراء پیش فرمائیں۔ وقت کافی بیت چکا تھا۔ تقریباً ایک بجے راقم الحروف نے حضرت ناظم اعلیٰ صاحب مدظلہٗ کو اس نشست کی اختتامی گفتگو کے لیے دعوتِ خطاب دی۔ انہوں نے جامعہ باب العلوم کہروڑ پکا کی انتظامیہ، اساتذہ اور ضلع لودھراں کی رابطہ کمیٹی اور علماء کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جنوبی پنجاب میں انعقاد پذیر کنونشنز کی غرض وغایت بیان فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ عالمی طاقتیں جنوبی پنجاب کو ہدف بنا کر یہاں کے مدارس اور مذہبی طبقہ کے خلاف نیا محاذ کھولنا چاہتی ہیں، اس کی پیش بندی کے طور پر یہ کنونشن منعقد کیے جا رہے ہیں۔ انہوں نے علماء کرام کو اخلاص

بقیہ صفحہ آخر پر ملاحظہ فرمائیں

دینی مدارس کی تاریخ

فقیہ العصر مفتی سید عبدالشکور ترمذیؒ
بانی جامعہ حقانیہ ساہیوال، سرگودھا

حامدًا و مصليًا و مسلمًا : قال النبي ﷺ : إنما بعثت معلماً . ترجمہ: میں تو صرف معلم واستاذ کی حیثیت سے آیا ہوں۔

نبی اکرم ﷺ کے ارشاد بالا سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت اور دنیا میں آپ کی تشریف آوری کا مقصد انسانی دل و دماغ میں ایسی دینی تعلیم کی روشنی پیدا کرنا ہے جس کے ذریعے انسان اپنے مالک حقیقی خداوند عالم کی مرضی کے موافق زندگی بسر کر سکے اور وہ تعلیم انفرادی، اجتماعی، دنیاوی اور اخروی تمام حالات میں اس کی رہنمائی اور ہدایت کر سکے، اسلامی تعلیم کی اس ہمہ گیر جامعیت کے پیش نظر فطری اور طبعی طور پر اسلام میں تعلیم و تعلم (علم سیکھنے اور سکھانے) کو جتنی اہمیت حاصل ہے اتنی کسی مذہب میں نہیں ہے۔ اس اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر حکومت اسلامیہ کے ترقی اور عروج کے زمانے تک کے عام مسلمانوں کی اسلامی تعلیم کے ساتھ دل چسپی اور وابستگی کے چیدہ چیدہ مختصر حالات اور امرا اور حکام اسلام کی علوم دینیہ کے اندر سعی اور کوشش کے چند واقعات پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

عہد رسالت اور مکی زندگی: رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے بعد کی بارہ سالہ مکی زندگی میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور مددگاران رسول ﷺ پر اگرچہ رات دن حوادث وافکار کا ہجوم رہتا تھا، لیکن اس آزمائشی دور میں بھی جس قدر پرسکون لمحے مسلمانوں کو مل جاتے تھے ان میں بھی وہ قرآن پاک کی خصوصی تعلیم کا اہتمام کیا کرتے تھے، اس دور کے ایسے تمام مقامات کو جن میں مسلمانوں نے خواہ تھوڑے عرصے کے لئے ہو بیٹھ کر پڑھنے کا انتظام کیا تھا، ہم ان کو "دینی مدرسہ" کے

نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مدرسہ صحنِ ابی بکر رضی اللہ عنہ: سب سے پہلے جس مقام کو ہم اس دور میں تعلیم کا مرکز کہہ سکتے ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ چبوترہ ہے جو آپ کے گھر کے سامنے تھا، جس پر آپ نماز وقرآن پڑھا کرتے تھے اور کفار کے لڑکے اور عورتیں آپ کے گرد جمع ہو جاتے اور قرآن کو سنتے تھے، یہ بات کفار کو ناگوار ہوئی اور انہوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اس چبوترے کے چھوڑنے پر مجبور کیا۔ (بخاری، کتاب بدء الخلق)

مدرسہ دار ارقم: مکی زندگی میں خاص ایسی جگہ جس میں مسلمان تعلیم کے لیے بلا روک ٹوک آتے جاتے ہوں اور اس میں طلباء کے لیے کھانے پینے اور خورد ونوش اور قیام کا انتظام ہو، اس پریشانی کے دور میں بظاہر اس کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا مگر حیرت کی کوئی انتہا نہیں حیرت رہتی جب ہم ارباب تاریخ وسیر کی دار ارقم کے متعلق بتائی ہوئی تفصیلات کو دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ یہ مقام کوہِ صفا کے دامن میں تھا، جس میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً چالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ قیام پذیر تھے، جن میں مرد اور عورتیں سب ہی شامل تھے، اس گھر کے قیام کے زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تھا۔ اس مکان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام کے قیام پذیر تھے اور باقاعدہ تعلیم وتعلم میں مشغول رہے، حضرت ابوبکر، حضرت حمزہ، حضرت علی رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ اس مکان میں رہتے تھے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا تعلیمی مشغلہ جاری تھا۔ اس مدرسہ دار ارقم کے نظام پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان سے بھی روشنی پڑتی ہے، ان کے فرمان کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''مسلمان ہونے والوں کو ایک ایک دو دو کر کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی صاحب حیثیت کے پاس بھیج دیتے تھے اور یہ لوگ اس کے پاس رہ کر کھانا کھاتے تھے، چنانچہ میرے بہنوئی کے گھر بھی دو آدمی موجود تھے، ایک خباب بن ارت تھے، خباب میرے بہنوئی اور بہن کے پاس جا جا کر قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ دار ارقم حضرت عثمان بن ارقع کے مکان میں تھا، یہ مکان اس زمانے میں دار ارقم کے بجائے اسلام کا مرکزی تعلیمی مقام ہونے کی وجہ سے دار الاسلام کے نام سے مشہور ہو گیا تھا''۔ (سیرت حلبیہ)

اسلام کے ابتدائی دور کے اس مختصر مدرسے کا نظام ناظرین کرام کے سامنے ہے کہ:

(۱)......طلباء کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی۔

(۲)......یہی جگہ پڑھنے کی بھی تھی اور رہائش کی بھی۔

(۳)......طعام کا انتظام یہ تھا کہ طلباء مال دار صحابہ کے گھروں پر بطور وظیفہ کے کھانا کھایا کرتے تھے۔

اس ابتلاء وآزمائش کے زمانہ میں تعلیم کے اس قدر انتظام اور اہتمام سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسلام میں تعلیمی مراکز اور مدارس دینیہ کے قیام کی کتنی ضرورت واہمیت ہے۔

مدرسہ شعب ابی طالب و مدرسہ بیت فاطمہ: اس کے علاوہ مکہ معظمہ میں ہجرت سے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی اور بہن کے مکان پر خباب بن ارت کے قرآن پڑھانے کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ نیز ''مدرسہ بیت فاطمہ اور مدرسہ شعب ابی طالب'' (جس میں نبی اکرم ﷺ نے مع اپنے ساتھیوں کے ۷ نبوی سے لے کر ۱۰ نبوی تک قریش مکہ کے ظالمانہ مقاطعہ کرنے کی وجہ سے تین سال کا زمانہ اسارت گزارا ہے) میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، اس کے نتیجے میں فضلائے مکہ کی ایک جماعت تیار ہوگئی اور دوسرے، مقامات پر بھی وہ تعلیمی کام کرنے لگے۔

مدرسہ حبشہ: جب کفار کے ظلم وستم سے تنگ آکر بعض صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی تو انہوں نے وہاں بھی تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری رکھا، اس کو ''مدرسہ ارضِ حبشہ'' کے نام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

مدنی زندگی: حضور ﷺ نے اپنی ہجرت سے بھی پہلے تعلیم دینے کے لیے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ روانہ فرمایا، انہوں نے سعد بن ضرارہ کے مکان پر قرآن کا باقاعدہ سلسلہ جاری فرمایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معدودے چند کے علاوہ تقریباً تمام انصار مدینہ مسلمان ہوگئے اور اپنے بت توڑ دیے اور جب مصعب بن عمیر مدینے سے لوٹ کر رسول ﷺ کے پاس آئے تو ان کا خطاب مقریٔ یعنی معلم پڑچکا تھا۔ (جمع الفوائد)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے پہلے مقریٔ (استاد) کا لقب حضرت مصعب کے نصیب میں تھا جس سے وہ معزز ہوئے اور انصارِ مدینہ کی مسجد بنی زریق میں حضرت رافع بن مالک رضی اللہ عنہ اور مسجد بنی بیاضہ میں حضرت سعد بن ضرارہ رضی اللہ عنہ پڑھایا کرتے تھے اور دار سعد بن خیثمہ نیز بنونجار، بنوعبدالاشہل، بنوظفر اور بنوعمرو بن عوف وغیرہم کے محلوں میں حضور ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی تعلیمی مراکز اور مدارس قائم ہوچکے تھے۔

مدرسہ قبا: مدرسہ قبا کا تو ایک مستقل نظام تھا، جو حضور ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی قائم ہوچکا تھا، کیوں کہ حضور ﷺ کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری سے پہلے ہی صحابہ کرام کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا اور مہاجرین عموماً قبا میں ہی قیام پذیر ہوتے تھے۔

مدرسہ صفہ: رسول اکرم ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد مسجد نبوی کی بنیاد رکھی گئی اور حجرہ شریفہ کی پشت پر جانب شمال بابِ جبرئیل اور باب النساء کے درمیان ایک وسیع چبوترہ ''دکۃ الاغوات'' کے نام سے موسوم تھا اس پر جو حضرات فروکش ہوتے تھے وہ ''اصحابِ صفہ'' کہلاتے تھے اور یہی چبوترہ کبھی اصحاب صفہ کا ''صفہ'' تھا، یہاں پر طلبہ کا ہجوم رہتا، بعض اوقات سینکڑوں کی تعداد ہوجاتی، تمام اصحابِ صفہ کی مجموعی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے، مختلف اوقات میں اس صفہ کے طلبہ کی تعداد ستر، اسی تک پہنچ جاتی تھی۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یہ کام سپرد تھا کہ جو امداد اصحاب ثروت کی طرف سے ان طلباء کے لیے آئے تو ان کی حفاظت کریں اور بحصۂ مساوی تقسیم کریں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذمہ طعام کا انتظام ہوتا تھا۔ کھانے کے سلسلے میں ایسا ہوتا تھا کہ کھجوروں کے گچھے مال دار صحابہ بھیج دیا کرتے تھے اور

بعض مال دار صحابہ ان کو اپنے ساتھ لے جاتے اور انہیں کھانا کھلا دیتے تھے، ان میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نہایت فیاضی سے کام لیتے تھے حتیٰ کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اسی اسی طلبہ ان کے گھر جا کر کھانا کھاتے تھے۔ (زرقانی)

جامعہ صفہ کے فاضلین قراء کہلاتے تھے۔ یہیں کے طلباء نے دنیا میں اسلام کے علوم کو پھیلایا اور وہی حضرات تعلیمی خدمات کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ عہد رسالت میں جامعہ صفہ کے علاوہ مدینہ منورہ کے اندر دوسرے مدارس کا ذکر بھی علامہ سمہودی نے کیا ہے، بعض کا ذکر اوپر اجمالاً ہو چکا ہے۔

عہد خلافت راشدہ: عہد رسالت کے بعد خصوصیت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں حجاز اور ہر اسلامی آبادی میں قرآن مجید کی تعلیم کے لیے مستقل حلقے اور مکاتیب قائم فرمائے، حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو دمشق میں شام کی جامع مسجد میں قرآن پاک کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا، ایک مرتبہ طلباء کا شمار کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ سولہ سو (1600) طالب علم ان کے حلقہ درس میں شریک ہیں۔ (طبقات القراء للذہبی: ۶۰۶)

قرآن مجید کے ساتھ حضرت عمرؓ نے درس حدیث کے حلقے قائم فرمائے، اس کام کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ایک گروہ کے ساتھ کوفہ اور معقل بن یسار، عبداللہ بن معقل اور عمران بن حصین کو بصرہ اور عبادہ بن صامت اور ابو درداء رضی اللہ عنہما کو شام میں مقرر فرمایا اور لوگوں کو تاکید کی کہ ان سے علم حدیث کی تحصیل کریں۔ (ازالۃ الخفاء)

علامہ ابن الجوزیؒ نے سیرۃ العمرین میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے جو مکاتیب قائم کیے تھے، ان میں معلمین کی تنخواہیں مقرر تھیں اور ہر ہر معلم کو پندرہ پندرہ درہم بیت المال سے ملتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں ان مدارس کو اور زیادہ وسعت ہوئی اور تمام ممالک مفتوحہ میں جابجا مکاتب اور مدارس قائم ہو گئے۔

عہدِ خلفاء وامراء اسلام:

عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے بعد اسلامی آبادی اور فتوحات میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیمی مکاتب میں بھی ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ خلفاء وامراء اور اربابِ ثروت نے اپنے گھروں میں بھی تعلیمی انتظام کیا اور کوئی قابل ذکر اسلامی آبادی ایسی نہیں ملتی جس میں درس وتدریس کا انتظام نہ ہو، تعلیم مفت ہوتی تھی، غریب طلبہ کے کھانے پینے اور لکھنے پڑھنے کی ضروریات بغیر کسی معاوضے کے پوری ہوتی تھیں۔

عہد قدیم کے علمی حلقوں کی اب صرف دو علمی یادگاریں باقی ہیں: پہلی تیونس کی جامع زیتون ہے جو تیسری صدی ہجری میں قائم ہوئی، یہ درس گاہ اس زمانے کے عام طرز کے مطابق تیونس کی جامع اعظم میں قائم ہے اور شروع سے اب تک خاص عظمت وشہادت کی مالک ہے۔

دوسری یادگار مصر کی جامع ازہر ہے، یہ عظیم الشان جامع مسجد فاطمی سلاطینِ مصر کے زمانہ کی یادگار ہے، جامع ازہر کی تکمیل 361ھ میں ہوئی ہے مگر اس کی علمی زندگی کی ابتداء چوتھی صدی اواخر سے ہوئی ہے۔ مسجد کا وسیع صحن ہے اور

اندرونی حصہ قدیم طرز کے علمی حلقوں کی درس گاہوں کے طور پر کام آتا ہے۔ جامع ازہر اسلامی دنیا کی سب سے بڑی اور قدیم یونی ورسٹی ہے، جو ایک ہزار سال سے جاری ہے اور آج جب کہ تقریباً تمام قدیمی مدارس صفحۂ ہستی سے محو ہو چکے ہیں، یہ یونی ورسٹی اسی قدیم شان وشوکت کے ساتھ باقی ہے، دس پندرہ ہزار طلباء اس کے اندر تعلیم حاصل کرنے والے اور سینکڑوں اساتذہ اس میں تعلیم دینے کے لیے موجود رہتے ہیں۔

جامع ازہر کے مصارف واخراجات کے لیے مصر کے مختلف سلاطین نے جو جاگیریں وقف کی ہیں ان کی سالانہ آمدنی لاکھوں پونڈ ہے، ابھی قریبی زمانہ میں دوسری جنگ عظیم سے کچھ پہلے کی بات ہے کہ مصر کے سابق شاہ فاروق نے اپنی جیبِ خاص سے ساٹھ ہزار مصری پونڈ جامع ازہر کو عطیہ کیے تھے۔ حکومت کی سرپرستی اور اوقاف کی آمدنی کی بدولت آج بھی یہ جامع ازہر اپنے اقتدار اور عظمت کے لحاظ سے اس درجہ اونچا اور بلند ہے کہ شیخ الازہر کے منصب کو مصر کی وزارت عظمیٰ سے بڑھ کر سمجھا جاتا ہے۔

علامہ مقریزی نے لکھا ہے کہ ”مدرسے کے بانی اول اہل نیشاپور ہیں، جہاں سب سے پہلے مدرسہ بیہقیہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ (۳۶۲/۲)۔ تاریخ فرشتہ میں ہے کہ ”۴۱۰ھ میں سلطان محمود غزنویؒ نے اپنے پایہ تخت غزنی میں ایک جامع مسجد عروس الفلک کے نام سے تعمیر کرائی اور اس کے ساتھ ایک عظیم الشان مدرسہ بھی تعمیر کرایا تھا، مدرسے کے ساتھ کتب خانہ بھی تھا جو نادر الوجود کتابوں کے ساتھ معمور تھا، مسجد ومدرسہ کے اخراجات کے لئے سلطان نے بہت سے دیہات کی آمدنی وقف کی تھی“۔

سلطان محمود کی اس مثال سے تھوڑے ہی دنوں میں غزنی کے اطراف وجنوب میں بے شمار مدارس قائم ہو گئے اور سلطان کے فرزند سلطان مسعود نے تو اپنے عہد سلطنت میں اس کثرت سے مدرسے قائم کیے کہ تاریخ فرشتہ کے بیان کے مطابق زبان ان کے شمار کرنے سے عاجز وقاصر ہے۔ اسی زمانے میں ابن خلکان کی روایت کے مطابق علامہ ابو اسحاق اسفرائنی (المتوفی ۴۱۸ھ) کے لیے نیشاپور میں ایک مدرسہ قائم ہوا۔

ان مدارس کے قیام کے کچھ عرصہ بعد دولت سلجوقیہ کے علم دوست وزیر نظام الملک طوسی (متوفی ۴۸۵ھ) نے نیشاپور اور بغداد میں دو دار العلوم قائم کیے، جن کو تاریخ کے اوراق میں ”نظامیہ“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دار العلوم کے لئے جو بغداد میں ۴۵۹ھ میں قائم ہوا تھا چھ لاکھ دینار (تیس لاکھ روپے) کی گرانقدر رقم شاہی خزانے سے مقرر تھی اور نظام الملک نے خود اپنی جاگیر کا دسواں حصہ اس کے لیے وقف کر دیا تھا، طلباء کے لئے وظائف کا انتظام کیا گیا اور اساتذہ کے لیے بیش قرار مشاہرے مقرر کیے گئے۔

نظام الملک نے نہ صرف نیشاپور میں اور بغداد میں ہی دار العلوم قائم کیے بل کہ اس نے حکم دے دیا کہ ملک میں جس جگہ بھی کوئی ممتاز عالم موجود ہو وہاں اس کے لئے ایک مدرسہ اور مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ تعمیر کر دیا جائے، چنانچہ

اس زمانے میں ہزاروں مدارس اور کتب خانے قائم ہوئے، اس سے قبل سلطان محمود غزنوی اور اس کے بیٹے سلطان مسعود غزنوی نے اپنے اپنے عہد میں بکثرت مدارس قائم کیے تھے، نظامیہ کے قیام سے قبل بھی اس نیشاپور میں سعدیہ اور بیہقیہ نام کے دو بڑے دار العلوم موجود تھے۔ سعدیہ سلطان محمود غزنوی کے بھائی امیر نصر نے قائم کیا تھا، امام الحرمین (امام غزالیؒ کے استاد) نے بیہقیہ میں تعلیم پائی تھی، جب نظامیہ قائم ہوا تو امام الحرمین کو اس کا صدر بنا دیا گیا۔

امام غزالیؒ جیسے یکتائے زمانہ نظامیہ کے خوشہ چینوں میں ہیں۔ نظامیہ کے علاوہ بغداد میں تیس اور بڑے دار العلوم قائم تھے، جن کے متعلق علامہ ابن جبیرؒ نے لکھا ہے کہ "ہر مدرسہ بجائے خود ایک مستقل آبادی معلوم ہوتا تھا"۔ نظام الملک کے بعد خلیفہ مستنصر باللہ عباسی نے بغداد میں ۶۳۱ھ میں ایک دار العلوم المستنصریہ کے نام سے قائم کیا۔ طلباء کے قیام وطعام، کاغذ، قلم، دوات وغیرہ اشیاء بھی مدرسے سے ملتی تھیں، اس کے علاوہ ایک دینار (تقریباً 5 روپے) ہر طالبعلم کو ماہانہ وظیفہ ملتا تھا، خلیفہ مستنصر باللہ نے ان مصارف کے لئے جو وقف کیا تھا اس کی آمدنی آج کل کے حساب سے چار لاکھ روپے سالانہ بنتی ہے۔

ہندوستان:

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا مستقل قیام ساتویں صدی ہجری کے شروع میں قطب الدین ایبک (۶۰۲ھ/۶۰۶ھ) سے شروع ہوتا ہے، اس پر بمشکل ایک صدی گذری تھی کہ ہندوستان علوم وفنون کا گہوارہ بن چکا تھا۔

علامہ مقریزی نے کتاب الخطط میں سلطان محمد تغلق کے زمانے کے دہلی کی نسبت لکھا ہے کہ "سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی کے اندر ایک ہزار اسلامی مدارس قائم تھے، جن میں مدرسین کے لئے شاہی خزانے سے تنخواہیں مقرر تھیں، تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک حافظ قرآن اور عالمہ ہوتی تھیں۔"

فیروز شاہ تغلق کے تعمیر کرائے ہوئے مدرسہ فیروز شاہی کے متعلق ضیاء برنی نے لکھا ہے: "مدرسہ کی عمارت نہایت وسیع ہے اور ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارے پر واقع ہے، ہر وقت سینکڑوں طلبہ، علماء وفضلاء یہاں موجود رہتے ہیں، باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے فرش پر نہایت آزادی کے ساتھ علمی مشاغل میں منہمک نظر آتے ہیں"۔

عالمگیر اورنگ زیب کے عہد کے متعلق ایک سیاح نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے: "سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ میں مختلف علوم وفنون کے چار سو مدارس قائم تھے"۔

حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ فرماتے ہیں کہ "نواب نجیب الدولہ کی سرکار سے نوسو علماء کو وظائف ملتے تھے" (ملفوظات)۔ روہیل کھنڈ جیسے غیر معروف خطے میں پانچ ہزار علماء مختلف مدارس میں درس دیتے تھے اور حافظ رحمت اللہ خان کی ریاست سے تنخواہ پاتے تھے۔

مختصر یہ کہ ہر زمانے میں مسلمانوں نے علم کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور سلاطین وامراء بھی علمی فیاضی اور علماء و

طلباء کی خدمت کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کو نجاتِ اخروی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ سلاطین وامراء کی طرف سے علماء وطلباء کے لئے جائیدادیں وقف تھیں، ان کی آمدنی ان کے خورد ونوش اور تعلیمی مصارف کے لیے کفیل تھی، اس طرح ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک تمام تعلیم عام اور مفت ہوتی تھی اور علماء وطلباء بھی اپنے اپنے متعلقین کے لئے کسب معاش سے مطمئن ہو کر فراغت وسکونِ خاطر کے ساتھ درس وتدریس میں مشغول رہتے تھے، نہ تو منتظمین مدارس کو چندوں کی اپیل کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی نہ ہی طلباء کو دست نگر سمجھ کر طالب علمی کو عزت نفس کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنے سے پہلے تک یہی نظام تعلیم جاری تھا، دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، جونپور، لکھنؤ، خیر آباد، پٹنہ، اجمیر، سورت، دکن، مدراس، بنگال اور گجرات وغیرہ کے بہت سے مقامات علم وفن کے مرکز تھے۔ صرف ایک صوبہ بنگال کے متعلق ایک انگریز مصنف کیبری ہارڈی نے "میکس مولر" کے حوالے سے یہ کیفیت بیان کی ہے: "انگریزی عمل داری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدارس تھے، اس طرح چار سو آدمیوں پر ایک مدرسہ کا اوسط نکلتا تھا، اسی صوبہ بنگال میں سلاطین وامراء نے مدارس کے لیے جو جائیدادیں وقف کی تھیں ان اوقاف کا مجموعی رقبہ مسٹر جیمز گرانٹ کے مطابق بنگال کے چوتھائی رقبہ سے کم نہ تھا، اوقاف کے علاوہ سلاطین وامراء نقد وظائف کے ذریعہ سے اہل علم کی اعانت کرتے تھے۔ مدارس اور درس گاہوں کا ملک میں پھیلا ہوا یہ عظیم الشان سلسلہ کیوں کر ٹوٹا اور یہ مدارس ومکاتب کیوں تباہ ہو گئے، اس سوال کے جواب کے لیے بارہویں صدی ہجری اور اٹھارویں صدی عیسوی کی ہندوستانی سیاسی تاریخ کا جاننا ضروری ہے۔

ہندوستانی سیاسی تاریخ:

ایسٹ انڈیا کمپنی جو ابتدا میں صرف تجارتی اغراض ومقاصد لے کر ہندوستان میں داخل ہوئی تھی، ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی مشہور جنگ نے اس کو ایک نئی اور زبردست طاقت میں بدل دیا، یہ نئی طاقت جس زمانے میں ظہور پذیر ہوئی اس وقت بدقسمتی سے مرکزی طاقت پارہ پارہ ہو چکی تھی اور ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، ہندوستان کی اس سیاسی کمزوری سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور وہ آہستہ آہستہ اپنی دسیسہ کاریوں اور ریشہ دوانیوں سے ملک پر قابض ہوتی چلی گئی تا آنکہ انیسویں صدی کے اوائل تک پنجاب کے علاوہ پورے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کر لیا، پرانے قانون اور قدیم نظام تعلیم وتہذیب کو منسوخ کر دیا، جن قدیم مصارف کے لیے سلاطین وامراء نے طویل مدت سے بڑے بڑے اوقاف مقرر کیے تھے (جن کی کچھ تفصیل اوراقِ گذشتہ میں گزر چکی ہے) کمپنی کی حکومت نے ان تمام اوقاف کو ۱۸۳۸ء میں ضبط کر لیا۔ وظائف حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی موقوف ہو چکے تھے، اس وقت تعلیم کا تمام تر دار ومدار ان

ہی اوقاف پر تھا جو اس مقصد کے لئے مخصوص کئے گئے تھے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے جو بنگال میں ایک بڑے سول عہدے پر فائز تھا ۱۸۷۱ء میں ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' نامی کتاب لکھ کر اس سلسلے کے تاریخی حقائق کو سرکاری کاغذات سے واشگاف کیا ہے۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ ''صوبۂ بنگال پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افسر مال جیمز گرانٹ کا بیان ہے کہ اس وقت صوبے کی آمدنی کا تخمیناً ایک چوتھائی حصہ جو معافیات کا تھا حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا''۔

۱۷۷۲ء وارن ہٹینگز نے اور ۱۷۹۲ء میں لارڈ کالونواس نے معافیات کی واپسی کی مہم شروع کی مگر ناکامی رہی۔ ۱۸۱۵ء میں حکومت نے اس معاملے کو زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرأت نہ ہوسکی، آخر ۱۸۳۸ء میں آٹھ لاکھ پونڈ کے خرچ سے مقدمات چلا کر ان معافیات اور اوقاف پر حکومت نے قبضہ پالیا۔ صرف ان معافیات کی آمدنی سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ یعنی تقریباً ۴۵ لاکھ روپے کا اضافہ ہوگیا۔ اس کاروائی کا مسلمانوں کی علمی زندگی پر کیا اثر پڑا اس کی نسبت ہنٹر لکھتا ہے: ''سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہوگئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار ان ہی معافیات پر تھا تہہ و بالا ہوگیا، مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے''۔

اندازہ کیجیے کہ جب ایک دور افتادہ صوبے بنگال میں جس کو اس زمانہ کے لحاظ سے کوئی خاص تعلیمی فوقیت اور مرکزیت حاصل نہ تھی تعلیمی اخراجات کی آمدنی کے لیے ۴۵ لاکھ روپے سالانہ آمدنی کے اوقاف میں موجود تھے تو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بالخصوص ان مقامات میں جن کو تعلیمی مرکزیت اور تفوق حاصل تھا کس قدر اوقاف ہوں گے۔

اوقاف کی ضبطی نے مسلمانوں کے تعلیمی نظام پر ایک ضرب کاری کا کام کیا، علماء اور اساتذہ جو اب تک ان ہی اوقاف کی آمدنی کی بدولت فکر معاش سے مطمئن اور بے فکر ہو کر درس و تدریس میں مصروف تھے وہ منتشر اور پراگندہ ہوگئے، مدارس اور درس گاہوں میں سناٹا چھا گیا، چنانچہ برک اپنی اس یادداشت میں جو برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کی گئی تھی لکھتا ہے: ''ان مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا اور جہاں دور دور سے طالب علم پڑھنے کے لئے آتے تھے آج وہاں علم کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا''۔

مگر ان حوادثاتِ زمانہ اور گردشِ ایام کے باوجود بھی ہندوستان میں کچھ ایسے سخت جان علماء موجود تھے جن کا علمی فیضان کسی مالی اعانت و امداد کا چنداں محتاج نہ تھا۔ دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کا خاندان اور لکھنؤ میں ملا نظام الدین کا گھرانہ اور خیر آباد کا مشہور علمی خانوادہ سینکڑوں میں چند ممتاز مثالیں ہیں، ایسے حضرات ہر قسم کے حوادثات و مصائب کو برداشت کر کے اپنے کام میں مصروف اور علمی خدمت میں ہمہ تن لگے ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی دارو گیر کا قیامت خیز ہنگامہ پیش آ گیا، گنے چنے علماء جو باقی رہ گئے تھے ان پر برطانوی حکومت نے بغاوت کا جرم عائد کر دیا، ان میں سے بعض کو پھانسی دی گئی، بعض کالے پانی بھیج دیے گئے اور کسی کو جلاوطن کر دیا گیا، جو بچے ان میں سے

اکثر ممالک اسلامیہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی رحمہ اللہ جو اس وقت ولی اللہی مسندِ علم کے جانشین تھے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے۔ ۱۸۳۸ء میں اوقاف کی ضبطی نے جو قدیم مدارس کو عظیم نقصان پہنچایا تھا انیس سال کے بعد ۱۸۵۷ء کے حادثے نے اس کی تکمیل کر دی، اب رہا سہا تعلیمی نظام بھی درہم برہم ہو گیا۔

قدیم مدارس اور مذہبی تعلیم کے ذرائع آمدنی اور اس کے متعلقہ لاکھوں روپیوں کے ان اوقاف کے تباہ اور برباد کرنے کے علاوہ (جن پر مذہبی تعلیم کا دارومدار تھا) کمپنی کی حکومت کے ۱۸۱۳ء کے ایک قانون کے ذریعہ یورپ کے پادریوں کو ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مشن اسکول کھولنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ پادریوں کی سرگرمیاں جاری تھیں، مشن اسکول کھولے جا رہے تھے جن میں حصولِ تعلیم کے لئے سہولتیں مہیاں کی جارہی تھیں، کمپنی کے حکام پشت پناہ تھے اور ہر قسم کی امداد و اعانت بہم پہنچاتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملازمتوں کا لالچ تھا۔ دوسری طرف کمپنی کی اسکیم یہ تھی کہ ہندوستان کے بسنے والوں خصوصاً مسلمانوں کو مفلس بنا کر اور ملازمتوں کے حصول کی ترغیب دلا کر مشن اسکول میں تعلیم دلانے میں مجبور کر دیا جائے جو اس وقت عیسائیت کی تبلیغ کے لیے سب سے بڑے ذریعے سمجھے جاتے تھے، اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹیں مسلمانوں کے علوم اور ان کا دینی شعور اور مذہبی شغف تھا۔

اس لئے ۱۸۳۵ء کا تعلیمی نظام مرتب کیا گیا جس کی روح لارڈ میکالے (جو کہ ۱۸۳۵ء کی تعلیمی کمیٹی کا صدر تھا) کے نزدیک یہ ہے، وہ لکھتا ہے: ’’ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہمارے اور ہماری رعایا کے درمیان مترجم کا کام دے سکے اور ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق، رائے اور الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو‘‘۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کمپنی کی یہ اسکیم اور اس کا یہ نظامِ تعلیم مسلمانوں کی مذہبی زندگی، قومی روایات اور علوم و فنون کے لئے سخت تباہ کن اور مہلک ترین حربہ تھا، اسی دوران ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آ گیا جس کی بے پناہ تباہ کاریوں اور ہولناکیوں نے دلوں کو ہیبت زدہ، دماغوں کو ماؤف اور روحوں کو پژمردہ اور پوری قوم کو مفلوج کر دیا، حالت یہ ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کو ذرائع معاش سے یکسر محروم کر دیا گیا، تعلیم سے بے رغبتی اور مذہب سے بیگانگی میں روز افزوں ترقی اور اضافہ ہو رہا تھا اور یہ وقت قریب تھا کہ علماء کی وہ نسل جو سابقہ درس گاہوں کی تعلیم یافتہ اور مذہبی شعور و احساس اپنے اندر رکھتی تھی رفتہ رفتہ ختم ہو جائے، ایسے حالات تھے جس کی وجہ سے ملک کے اربابِ علم و فضل نے یہ محسوس کیا کہ سیاسی زوال و انحطاط اور حکومت سے محرومی کے ساتھ ساتھ اب مستقبل میں مسلمانوں کا علم، مذہب اور قومی زندگی بھی سخت خطرے میں ہے، ان کی دور بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ فاتح قوم کے اثرات اور اس کے خصائص مفتوح قوم کے دل، دماغ اور علم و فکر پر اثر انداز ہو کر اس کے ملّی شعائر، قومی خصائص اور فکر و عمل کی صلاحیتوں کو مٹا کر رکھ دیں گے، جس کا

لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسلامی روایات اور اسلامی طور وطریقہ سے نفرت کرنے لگے گی اور اس کے لیے صرف فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلید واتباع ہی سرمایہ افتخار واعزاز بن کر رہ جائے گی، اس وقت مذہبی تعلیم کے سوا اور کوئی چیز فائدہ منداور کارگر نہیں تھی جس سے اس خطرہ کا سد باب ہوسکے، یہی ایک ایسی چیز تھی جس کے ذریعے سے مسلمان اپنے مذہبی شعائر اور قومی خصائص کا تحفظ کر سکتے تھے اور مغلوب ومحکوم ہونے کے باجود وہ بحیثیت مسلمان قوم کے زندہ رہ سکتے تھے، اسی لیے اس وقت علمائے کرام اور مذہبی رہنماؤں نے گردوپیش کے غیر مساعد حالات اور زمانے کے دنیاوی تقاضوں سے بے نیاز ہوکر فاتح قوم کے ارادوں اور اسکیموں کے علی الرغم مسلمانوں کو اسلامی علوم وفنون کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی، جس کے ذریعے ان میں آئندہ مذہبی شعور کو برقرار رکھا جاسکتا تھا اور اس کے لیے قدیم مذہبی مدارس کی نشاۃِ ثانیہ کو ضروری سمجھا گیا اور اس مقصد کے لیے مدارس عربیہ قائم کیے گئے۔

مدارس عربیہ کی نشاۃ ثانیہ کا یہ کام ایسے ماحول اور دور میں شروع ہوا جب کہ قومِ مسلم بحیثیت قوم مفلس ونادار اور حکومتِ متسلطہ کی دست نگر تھی اور وہ تمام اوقاف وغیرہ پہلے ہی ضبط کر لیے گئے تھے جن پر دینی تعلیم کی کفالت کا مدار تھا، اسی مفلسی وناداری سے متاثر ہوکر بعض ہمدردانِ قوم نے محض دنیوی خیر خواہی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حکومت متسلطہ کی زبان اور علوم وفنون کے پڑھنے کو ضروری سمجھا تاکہ اس کے ذریعے سے ملک میں منصب وعہدے بھی حاصل کیے جاسکیں اور اس سے معاشی ضروریات بھی پوری کی جاسکیں، اسی لیے انہوں نے لارڈ میکالے کی تجویز کردہ تعلیمی اسکیم کی ہم نوائی کرتے ہوئے ایسے اسکولوں اور کالجوں کی طرف رخ کیا جن کی ڈگریوں اور سرٹیفکٹوں کے حصول پر ہی ملازمتوں اور عہدوں کے ملنے کا مدار تھا، مگر اس کس مپرسی، بے بسی اور بے سروسامانی کی حالت میں بعض اہل دل اللہ والوں کے قلوب میں مدارس دینیہ کے احیاء کا داعیہ پیدا ہوا اور ایک مردِ حق آگاہ اور درویشِ کامل عالمِ ربانی حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ نے ۱۸۶۷ء میں توکلاً علی اللہ دیوبند ضلع سہارنپور کی تاریخی مسجد چھتہ میں دارالعلوم کی بنیاد رکھ دی اور تعلیم وتبلیغ نبوی کا نظام پھر سے قائم کردیا۔

الحمدللہ! ایک مسجد میں شروع ہونے والا یہ دارالعلوم بہت جلد دنیا کی ایک بہت بڑی دینی درس گاہ بن گئی اور دور دراز ممالک اور ہندوستان کے گوشے گوشے سے نہ صرف یہ کہ لوگ جوق در جوق علوم دینیہ کے حاصل کرنے لیے یہاں جمع ہونے لگے بل کہ ملک کے کونے کونے، شہر شہر، قریہ قریہ اس کی شاخیں قائم ہوگئیں اور شجر طوبیٰ کی شاخوں کی طرح ہر طرف پھیل گئیں۔ اس دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل حضرات میں سے بہت سے حضرات آسمان علم پر مہر وماہ کی طرح چمکے، جیسے: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، شیخ المحدثین مولانا خلیل احمد سہارنپوری صاحب، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمھم اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً وغیرہم۔

ان میں سے صرف حضرت تھانوی کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پرانے قصبہ تھانہ بھون کی پرانی مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اس زندہ دل درویش نے اصلاحِ امت کے لیے تعلیمی اور تبلیغی کتنا عظیم الشان کام کیا ہے۔ حضرت والا کی تقریباً نوسو (۹۰۰) تصانیف، تالیفات، مواعظ وملفوظات کے اوراق کو زندگی کے ایام پر پھیلایا جائے تو اوراق کی تعداد ایام زندگی سے بڑھ جاتی ہے۔

ہندوستان میں ان دینی مدارس سے کیسے کیسے علمائے حق پیدا ہوئے اور انہوں نے مذہب وملک کی کیا کیا گراں قدر خدمات انجام دیں یہ ہمارے موضوع میں داخل نہیں، اس وقت صرف اتنی بات عرض کر دینا ضروری سمجھا گیا کہ علمائے حق نے یہ دینی مدارس ایسے وقت میں قائم کیے جس وقت ان مدارس کے نظامِ تعلیم وتبلیغ کو نہ کسی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور نہ قومی خزانے کی پشت پناہی اور نہ ہی ملک کے لاکھوں روپیوں کی اوقاف کی آمدنی سے ان کو امداد حاصل ہوتی تھی، بل کہ یہ نظام بظاہر صرف ملک کے دینی شعور واحساس رکھنے والے اہلِ خیر کی مالی امداد وتعاون اور چندے کے موجودہ طریقے پر چل رہا تھا اور در حقیقت بے سروسامانی اور محض اللہ کے بھروسے پر اس نظام کی بنیاد تھی، غرض یہ کہ چندے کے موجودہ طریقے کی بنیاد پر مدارس دینیہ کا قیام کیا گیا اور ملک میں جا بجا مدارس قائم کر دیے گئے، اس وقت سے یہ نظام مدارس کے لیے جاری ہو گیا۔

علماء نے قوم کے سامنے دستِ سوال دراز کیا، مدارس کے لیے چندے مانگے، ہر طرح کے طعنے سنے، کئی قسم کے اعتراضات برداشت کیے مگر تعلیمِ مذہب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور فاتح قوم انگریز کے منصوبے کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ مدارس نے نہ صرف یہ کہ کمپنی کی تجویز کردہ لامذہب بنانے والی مذکورہ تباہ کن اسکیم اور مہلک ترین حربے کی زد سے علم و مذہب کو بچا لیا اور عیسائیت کے تیز وتند طوفان اور بڑھتے ہوئے سیلاب عظیم کی لپیٹ سے ملک کو محفوظ کر لیا، بل کہ مسلمانوں کو بحیثیت قومِ مسلم کے مٹنے اور ختم ہونے سے بھی بچا لیا، ورنہ یہ نظامِ تعلیم اور مشن اسکول اور عیسائیت کی اشاعت کے لیے پادریوں کی سرگرمیاں جس کے پیچھے حکومتِ وقت کی بے پناہ قوت کام کر رہی تھی، ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتے اور ہندوستان کے مسلمانوں کا وہی حال ہوتا جو اسپین کے مسلمانوں کا ہو چکا تھا کہ وہاں کی عیسائی حکومت کی بدولت وہاں کے تمام باشندے عیسائی ہو چکے تھے (نعوذ باللہ منہ)۔

ان مدارس کا ملت و مذہب اور قومِ مسلم کو اغیار کے حملوں سے بچا لینا ہی کیا ایسا ناقابلِ معافی عظیم جرم ہے کہ جس کی پاداش میں سب سے بڑی اسلامی سلطنت پاکستان کے بسنے والے بعض طبقے یہ کہتے نہیں تھکتے کہ تعلیمِ جدید کے اس دور میں دینی مدارس کا کیا فائدہ ہے اور ان پر قوم کی دولت اور وقت کیوں ضائع کیا جا رہا ہے؟

قوم کے ان بہی خواہوں اور ہمدردوں سے یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ اگر ان مدارس کا قیام نہ کیا جاتا اور لارڈ میکالے کا مرتب کردہ نظامِ تعلیم اور عیسائیت کی تبلیغ کے لیے حکومتِ متسلطہ کی مساعی کے سامنے علمائے حق بھی گھٹنے ٹیک دیتے اور

بڑے بڑے منصوبوں، عہدوں اور تنخواہوں کے لالچ میں آ کر انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا رُخ کر لیتے تو کیا ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی دور کے تقریباً سوسالہ زمانہ میں مذہب کے تحفظ اور اس کے بقاء کی کوئی صورت باقی رہ گئی تھی۔

غور فرمایا جائے کہ جب مذہب ہی باقی نہ رہتا اور مسلمانوں کو بحیثیت قوم مسلم کے ختم کر کے عیسائیت اور لادینیت میں جذب کر لیا جاتا تو پھر پاکستان کا مطالبہ کرنے اور اس کی عمارت قائم کرنے کے لیے مسلم قومیت کا بنیادی نظریہ کہاں سے دستیاب ہوتا؟

یہ مدارس دینیہ کیا اسی لیے بے ضرورت ہیں اور ان پر قوم کی دولت اور وقت کا خرچ کرنا قومی سرمایہ کا ضیاع ہے کہ ان مدارس نے مسلم قومیت کا تحفظ کیا اور اس کو حکومتِ وقت کی پوری کوشش کے باوجود مٹنے نہیں دیا، جس کے نتیجے میں دنیائے اسلام کی سب سے بڑی سلطنت پاکستان، قومِ مسلم کو خداوند قدوس کی جانب سے عطا کی گئی ہے مگر ہم نے اس قدر نہیں کی اور اس میں اسلامی نظام جاری نہیں کیا جس کی وجہ سے اس کا ایک بہت بڑا حصہ علیحدہ ہو گیا اور باقی حصہ بھی خطرے میں ہے، جس قوم کو ان مدارس کی مساعی جمیلہ کی بدولت اتنی عظیم الشان حکومت حاصل ہوئی ہو اور جو مدارس حکومت کی بنیاد (مذہب) کے محافظ ہوں، کیا اسی قوم کا سرمایہ ان مدارس پر صرف کرنا بے فائدہ اور ضائع کرنا ہے؟

یاد رکھیے! جس طرح دینی مدارس سے مذہب اور اسلامی قومیت کی حفاظت ہوتی ہے اسی طرح ملک کی حفاظت اور اس کے استحکام کا دارومدار بھی انہی مدارس پر ہے اور جس طرح مطالبہ پاکستان کے لیے مسلم قومیت اور مذہبِ اسلام مستحکم اور مضبوط چٹان کی طرح ثابت ہوئے، جو ان سے ٹکرایا پاش پاش ہو گیا، اسی طرح آج بھی پاکستان کے بقا واستحکام کے لیے ان کو وہی حیثیت اور مقام حاصل ہے جس کا ستمبر ۶۵ء کی جنگ میں مشاہدہ بھی ہو چکا ہے اور اسلام اور مسلم قومیت کی بقا اور حفاظت کی ضامن چونکہ صرف یہی دینی تعلیم ہے جو مدارس دینیہ سے حاصل ہوتی ہے، اس لیے جتنی اہمیت اور ضرورت انگریزی دور میں دینی مدارس کے بقا اور قیام کی تھی اس سے بڑھ کر ان مدارس کی آج پاکستان میں ضرورت ہے، اس لیے کہ یہ مدارس جس طرح ملت اسلام اور دینی تعلیم کی حفاظت کے واسطے مضبوط قلعے ہیں اسی طرح ملک پاکستان کو بھی اغیار کے حملوں سے بچانے کے مضبوط و مستحکم اڈے ہیں۔ ان مدارس سے غفلت برتنا اور ان کے وجود کو ہی بے کار سمجھنا اور حسبِ استطاعت ان کی ترقی میں حصہ نہ لینا ملت اسلامیہ اور ملکِ پاکستان دونوں کی بنیاد سے بے پرواہی برتنے اور چشم پوشی کرنے کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ملتِ اسلام اور ملکِ پاکستان کے پاسبان ومحافظ، مدارسِ دینیہ کی امداد وحفاظت اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وما علینا إلا البلاغ المبین وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین.

☆......☆......☆

مدارك التنزيل و حقائق التأويل

(وہ کتابیں اپنے آباء کی......اس عنوان کے تحت اسلام کے مصادر ومراجع میں سے کسی ایک کتاب کا تفصیلی تعارف پیش کیا جاتا ہے، اس بار مشہور کتاب تفسیر نسفی کا تعارف نذر قارئین ہے)

مولانا نور الرحمن ہزاروی

تفسیر مدارک اور فقہی مسائل! آیات احکام کی تفسیر کرتے ہوئے امام نسفیؒ ان آیات سے متعلق فقہی مذاہب بھی بیان کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، مگر ان میں زیادہ خوض نہیں فرماتے، چونکہ مسلکاً حنفی ہیں، اس لیے اپنے مذہب کا دفاع کرتے اور دیگر اہل مذاہب پر رد کرتے ہیں، بطورِ نمونہ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

سورۃ الطلاق کی آیتِ کریمہ: ﴿أسكنوهنّ من حيث سكنتم من وُجدكم ولا تُضارّوهنّ لِتُضيّقُوا عليهنّ وإن كنّ أولات حمل فأنفقوا عليهنّ حتّى يضعن حملهنّ فإن أرضعن لكم فآتوهنّ أجورهنّ . . . ﴾ کی تفسیر کے ذیل میں انہوں نے فرمایا: . . . . والنفقة والسكنى واجبتان لكل مطلقة . وعند مالك والشافعيّ :ليس للمبتوتة إلّا السكنى، ولا نفقة لها . وعن الحسن والحماد : لا نفقة لها ولا سكنى ؛ لحديث فاطمة بنت قيس :أن زوجها بتّ طلاقها ، فقال رسول الله ﷺ :لا سكنى لك و لا نفقة . وعن عمر رضي الله تعالى عنه: لا ندع كتاب ربّنا ولا سنّة نبيّنا بقول امرأة لعلّها نسيت أو شبّه لها ، سمعت النبي ﷺ يقول : لها السكنى والنفقة . . . ﴿ فإن أرضعن لكم ﴾ يعني : هؤلاء المطلقات إن أرضعن لكم ولداً من ظئرهنّ أو منهنّ بعد انقطاع عصمة الزوجية ﴿ فآتوهنّ أجورهنّ ﴾ فحكمهن في ذلك حكمُ الآظار . ولا يجوز الاستئجار إذا كان الولد منهنّ مالم يبنّ. ويجوز عند الشافعي.(مدارك التنزيل :٢/ ١٨٢٥،١٨٢٦)

..........اس آیت کریمہ کے تحت امام نسفیؒ نے دو مسائل ذکر فرمائے: پہلا مسئلہ یہ بیان فرمایا کہ احناف کے ہاں ہر قسم کی مطلقہ کے لیے سکنیٰ اور نفقہ واجب ہے، جب کہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے ہاں مبتوتہ (مطلقہ بائنہ) کے لیے سکنیٰ تو ہے، مگر نفقہ نہیں۔ امام حسن اور امام حماد تو مبتوتہ کے لیے نہ نفقہ کے قائل ہیں اور نہ سکنیٰ کے۔ ان کی دلیل حضرت فاطمہ بنت قیس کی حدیث ہے کہ ان کے شوہر نے ان کو طلاق بائن دی تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ”تیرے لیے نہ سکنیٰ ہے اور

نہ نفقہ''۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: ہم ایک عورت کی بنا پر اپنے رب کی کتاب اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کو نہیں چھوڑ سکتے، پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کہی ہوئی بات بھول چکی ہے یا اس کو اشتباہ ہوگیا ہے، جب کہ میں نے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ایسی عورت کے لیے نفقہ اور سکنیٰ دونوں ہیں......اس کے بعد انہوں نے دوسرا مسئلہ مطلقہ عورت کو سابقہ خاوند کے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت دینے سے متعلق بیان فرمایا کہ مطلقہ عورت اگر سابقہ خاوند کے بچے کو دودھ پلائے، خواہ یہ بچہ خود اس عورت نے عصمت زوجیت کے انقطاع کے بعد جنا ہو یا خاوند کی دوسری بیوی کا ہو تو خاوند پر لازم ہے کہ وہ بچے کو دودھ پلانے کی اجرت اس مطلقہ کو دے، اس بابت اس کا حکم اتنا کا ہے، ہاں اگر عصمت زوجیت کے منقطع ہونے سے پہلے جنا ہو تو پھر اجرت جائز نہیں، البتہ امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے۔

نوٹ: خط کشیدہ عبارت ہم نے ''کشاف'' سے لی ہے، یہاں تفسیر مدارک میں عبارت یوں تھی: وعند مالك والشافعي: لا نفقة للمبتوتة؛ لحديث فاطمة بنت قيس . . . مگر ظاہر ہے کہ فاطمہ بنت قیس کی حدیث نہ امام مالک اور امام شافعی کی دلیل ہے اور نہ بن سکتی ہے، جس سے ہمیں تشویش ہوئی، اچانک اس پر حاشیہ میں محقق کی تعلیق دیکھی، جنہوں نے لکھا ہے: کشاف کی عبارت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ''سقط'' ہوا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کشاف کی وہ عبارت ذکر کی، جس پر ہم نے خط کھینچا ہے۔ ہم نے بھی ''کشاف'' کی مراجعت کی تو معلوم ہوا کہ واقعۃً سقط ہوا ہے، جس پر ہم نے وہاں سے بقیہ عبارت لی اور بات بن گئی......دوسرا خط کشیدہ لفظ " بتّ " ہے، ''مدارک'' میں " أبی " کا لفظ ہے، جو یہاں لگتا نہیں ہے، ''کشاف'' کی طرف رجوع کیا تو وہاں " أبت " کا لفظ تھا، اس پر شیخ محمد علیان مرزوقی کا حاشیہ دیکھا تو انہوں نے ''تفسیر نسفی'' کے کسی نسخہ کا حوالہ دیا ہے کہ اس میں " بتّ " لکھا ہوا ہے، لہٰذا یہاں بھی " بتّ " ہی ہوگا اور یقیناً ایسا ہی ہے۔

تفسیر نسفی اور قراءات قرآنیہ! علم تفسیر اور علم قراءات اگرچہ دونوں مستقل علوم ہیں کہ اول کا مرجع درایت اور ثانی کا روایت ہے، مگر چونکہ روایت کا درایت کی تحقیق میں اور درایت کا روایت کی تحقیق میں گہرا اثر ہے، اس لیے باوجود دونوں کے جدا اور مستقل ہونے کے دونوں کے درمیان گہرا ارتباط و تعلق ہے، چنانچہ ابن عاشور کہتے ہیں:" ورجحان قراءة من القراءتين يرجّح أحد المعنيين المفروضين في تفسير الآية ، و رجحان أحد المعنيين قد يرجّح إحدى القراءتين على الأخرى ". (التفسير و رجاله: ص ٢٥) یعنی: ''دو قراءتوں میں اگر کوئی قراءت راجح ہو تو وہ متعلقہ آیت کے دو محتمل معنوں میں سے ایک معنی کو راجح کر دیتی ہے اور اسی طرح دو معنوں میں سے جو معنی راجح ہوں تو وہ دو قراءتوں میں ایک کو ترجیح دینے میں معاون ہوتے ہیں۔''

امام نسفیؒ بھی چونکہ علم تفسیر اور علم قراءات کے اس گہرے تعلق سے واقف ہیں، اس لیے وہ اپنی تفسیر میں جا بجا دیگر قراء

توں کا بھی ذکر کرتے ہیں، کتاب میں اس کی سینکڑوں مثالیں ہیں، بطور نمونہ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

سورۃ الحاقہ کی آیات کریمہ: ﴿وما هو بقول شاعر قليلاً ما تؤمنون ○ ولا بقول كاهنٍ قليلاً ما تذكّرون ○﴾ کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا: . . . وبالياء فيهما :مكيٌّ و شاميّ و يعقوب و سهل . و بتخفيف الذال كوفيّ غير أبي بكر . . . (مدارك التنزيل :١٨٥٩/٣) یعنی: "تؤمنون " اور " تذكرون " میں ایک قراءت ''یاء'' (صیغہ جمع مذکر غائب) کے ساتھ ہے۔ یہ قراءت اہل مکہ، اہل شام، امام یعقوب اور امام سہل کی ہے، اسی طرح امام ابوبکر کے علاوہ اہل کوفہ کی قراءت " تذكرون " میں ذال کی تخفیف کے ساتھ ہے۔

امام نسفیؒ اور اعرابی مباحث! امام نسفیؒ آیات کریمہ کی تفسیر کے ذیل میں بقدر ضرورت صرفی اور اعرابی مباحث سے بھی تعرّض کرتے ہیں، کسی لفظ کی اعرابی حیثیت بیان کرتے ہوئے وہ خروج عن المبحث یا خلطِ مبحث کا ارتکاب نہیں کرتے، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ صرفی یا اعرابی بحث کے دوران گہرائی میں جائیں۔ بطور نمونہ دونوں کی ایک ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

سورۃ الفاتحہ کہ آیت کریمہ: ﴿غير المغضوب عليهم ولا الضالّين﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: بدل من ﴿الذين أنعمت عليهم﴾، يعني : أن المنعم عليهم هم الذين سلموا من غضب الله والضلال ، أو صفة للذين ، يعني: أنهم جمعوا بين النعمة المطلقة - وهي نعمة الإيمان - و بين السلامة من غضب الله والضلال . وإنما ساغ وقوعُه صفة للذين وهو معرفة ، و غير لا يتعرّف بالإضافة ؛ لأنه إذا وقع بين متضادين و كانا معرفتين تعرّف بالإضافة ، نحو: عجبت من الحركة غير السكون ، والمنعم عليهم والمغضوب عليهم متضادّان ، ولأن الذين قريب من النكرة ؛لأنه لم يرد به قومٌ بأعيانهم و غير المغضوب عليهم قريب من المعرفة للتخصيص الحاصل له بإضافته . فكلّ واحد منهما فيه إبهام من وجهٍ واختصاص من وجهٍ ؛ فاستويا . "وعليهم" الأولى محلّها النصب على المفعوليّة . و محلّ الثانية الرفع على الفاعلية .(مدارك التنزيل :٢٢،٢١/١)........ "غير" کی اعرابی حیثیت واضح کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: یہ " الذين " سے بدل ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ ''منعم علیہم وہ لوگ ہیں جو اللہ کے غضب اور گمراہی سے بچے رہیں'' یا " غير "، " الذين " کی صفت ہے اور مطلب آیت کریمہ کا یہ ہے کہ ''منعم علیہم نعمت کاملہ یعنی نعمت ایمان سے بھی سرفراز ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور گمراہی سے بھی بچ گئے''۔ رہی یہ بات کہ " غير " تو اضافت کی وجہ سے معرفہ نہیں ہو سکتا تو اس کا " الذين " معرفہ کے لیے صفت بننا کیوں کر درست ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ " غير " جب دو ایسے متضادان کے درمیان واقع ہو جو دونوں معرفہ ہوں تو اضافت کی وجہ سے اس میں تعریف آجاتی ہے، جیسے: قائل کے اس قول میں ہے: عجبت من الحركة غير السكون اور پیش نظر آیت کریمہ میں بھی " غير " متضادین معرفہ کے درمیان واقع ہے، اس کے علاوہ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ " الذين " کی تعریف بھی ناقص ہے، یہ نکرہ کے قریب ہے، کیوں کہ اس سے کوئی متعین قوم مراد نہیں ہے

اور " غیر المغضوب علیھم "معرفہ کے قریب ہے اور یہ قرب اسے اضافت کی وجہ سے حاصل ہوا ہے، گویا " الذین "اور " غیـــر " دونوں میں سے ہر ایک میں من وجہ ابہام بھی ہے اور تخصیص بھی، پس دونوں ابہام اور تخصیص کے اعتبار سے مساوی ہوئے ،لہٰذا" غیر " کا" الـذیـن " کی صفت بننا درست ہوگا۔ نیز پہلا " عـلیھـم " مفعول بہ ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور دوسرا" علیھم " نائب فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیت کریمہ:﴿ هـدىً للمتقين ﴾ کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا: . . . . والـمتقي في اللغة : اسم فـاعـل من قولهم :وقاه فاتقى، ففاؤها واو، ولامها ياء . وإذا بنيت من ذلك افتعل قلبت الواو تاءً ، وأدغمتها فـي التـاء الأخـرى ، فـقـلـت : اتَّقَى.(مدارك التنزيل:١/٢٧)......... " المتقي" کی لغوی صرفی تحقیق کرتے ہوئے فرمایا:یہ''وقاہ فاتقیٰ'' سے اسم فاعل ہے،اس کا فاء کلمہ واو اور لام کلمہ یاء ہے اور لفیف مفروق یا مثال سے افتعال کے صیغے بناتے وقت واو کو تاء سے بدل کر اس تاء مبدلہ کو تاء افتعال میں مدغم کر دیتے ہیں،لہٰذا "وقی" سے "اتقی "ہوگیا۔

امام نسفیؒ اور اشعار عرب سے استشہاد! امام نسفیؒ آیات کریمہ کی تفسیر کے دوران بعض الفاظ کے لغوی یا مرادی معنی بیان کرتے ہوئے یا اعرابی ونحوی بحث ذکر کرتے ہوئے بکثرت فصحائے عرب کے اشعار سے استشہاد کرتے ہیں۔تفسیر مدارک میں اس کی متعدد مثالیں ہیں،بطور نمونہ دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

سورۃ البقرہ کی ابتدائی چار آیات:﴿ هـدىً للمتقين . . . و بالآخرة هم يو قنون ﴾ کی تفسیر کے ذیل میں انہوں نے والـذين يؤمنون کے متعلق ایک احتمال یہ بیان فرمایا کہ یہ " المتقين " کی صفت بھی ہوسکتی ہے،جس طرح ﴿ الـذين يؤمنون بـالغيب . . . ﴾ اس کی صفت ہے،البتہ یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ اگر یہ صفت ہے تو واو عاطفہ پھر کیوں لایا گیا ہے؟اس کا جواب یہ دیا ہے کہ صفات کے درمیان واو لانا ثابت ہے، جیسے:آپ کا یہ قول:" هو الشجاع والجواد" اور شاعر کا یہ شعر:

إلى الملِكِ القَرمِ وابنِ الهُمامِ   وليثِ الكَتِيبةِ في المزدَحَمُ

اس شعر میں " الملك "موصوف ہے اور " القرم "اس کی صفت ہے،"ابن الهمام"اور " ليثِ الكتيبة "تینوں اس کی صفات ہیں،جن کے درمیان واو عاطفہ لایا گیا ہے تا کہ ان صفات کا موصوف کے ساتھ ربط مؤکد و مضبوط ہوجائے۔ (مدارك التنزيل:١/٢٩)

اسی طرح سورۃ البقرۃ کی آیت کریمہ:﴿ إنهـا بـقـرة لا فارضٌ ولا بكرٌ عوانٌ بين ذلك . . . ﴾ کی تفسیر کے ذیل میں انہوں نے فرمایا: . . . ولـم يـقـل بيـن ذيـنك مع أنّ بين يقتضي شيئين فصاعداً ؛ لأنه أراد بين هذا المذكور ، وقد يجرى الضمير مجرى اسم الإشارة في هذا ، قال أبو عبيدة : قلت لرؤبة في قوله :

فيها خطوط من سواد و بَلَق   كأنه في الجِلْدِ توليع البَهَق

إن أردت الـخـطـوط فقل : كأنّها ، وإن أردتِ السواد والبلق فقل : كأنهما ،فقال : أردت : كأن ذاك

(مدارك التنزيل : ۱/ ۷۸)............ یہاں امام نسفیؒ نے ایک اشکال ذکر کر کے اس کا جواب دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ "بین" دو یا زائد چیزوں کا تقاضہ کرتا ہے، نظر بر آن "بین ذلك" کے بجائے "بین ذینك" کہنا چاہیے تھا۔ اس کا جواب یہ دیا کہ "ذلك" بھی شیئین کے معنی میں ہے، اس طور پر کہ اس سے سابق میں مذکور "فارض" "و بکر" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ادنی مناسبت سے ایک مفید قاعدہ بتایا کہ جس طرح اسم اشارہ واحد مذکر کے ذریعے متعدد امور کی طرف مذکور وغیرہ کی تاویل سے اشارہ کیا جا سکتا ہے، اسی طرح ضمیر واحد مذکر کو بھی بتاویل مذکور متعدد چیزوں کی طرف لوٹایا جا سکتا ہے۔ اس پر انہوں نے بطور استشہاد ابو عبیدہ اور رؤبہ بن العجاج کا مناظرہ ذکر کیا کہ ابو عبیدہ نے رؤبہ کے اس شعر پر اعتراض کیا:

فيها خطوط من سواد و بَلَق   كأنّه في الجِلْدِ توليع البَهَق

اور کہا کہ تمہاری مراد خطوط (لکیریں) ہیں تو تمہیں مؤنث کی ضمیر لاتے ہوئے "كأنها" کہنا چاہیے تھا اور اگر تمہاری مراد "سواد" اور "بلق" ہیں تو تثنیہ کی ضمیر لاتے ہوئے "كأنهما" کہنا چاہیے تھا، جب کہ تم نے "كأنّه" کہا ہے۔ اس پر رؤبہ بن العجاج نے اس کو جواب دیا: أردت : كأن ذاك . مطلب یہ ہے کہ یہاں میں نے ضمیر واحد مذکر کو اسم اشارہ واحد مذکر کی طرح استعمال کیا ہے، جس طرح اسم اشارہ واحد مذکر سے متعدد چیزوں کی طرف بتاویل "مذکور" اشارہ کیا جا سکتا ہے، اسی طرح ضمیر واحد مذکر کو بھی بتاویل مذکور متعدد چیزوں کی طرف لوٹایا جا سکتا ہے۔

تفسیر نسفی اور علوم بلاغت! ہم پچھلے صفحات میں بارہا ذکر کر آئے ہیں کہ تفسیر نسفی درحقیقت تفسیر کشاف کی تلخیص اور تہذیب ہے، چنانچہ دیگر متعدد پہلوؤں سے تفسیر کشاف سے استفادہ کے علاوہ امام زمخشریؒ نے اپنی تفسیر میں جو بلاغی نکتے اور بدیعی محسّنات ذکر کیے ہیں، امام نسفیؒ نے اختصار کے ساتھ وہ تمام چیزیں اپنی تفسیر میں ذکر کی ہیں، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں

☆...... سورۃ الفاتحہ کی آیت کریمہ: ﴿إياك نعبد وإياك نستعين﴾ کی تفسیر کے تحت انہوں نے فرمایا: . . . .

وعدل من الغيبة إلى الخطاب للالتفات ،وهو : قد يكون من الغيبة إلى الخطاب ، ومن الخطاب إلى الغيبة ، ومن الغيبة إلى التكلّم ، كقوله تعالى:﴿ حتى إذا كنتم في الفلك و جرين بهم بريح طيّبة ﴾ ،وقوله:﴿ والله الذي أرسل الرياح فتثير سحاباً فسقناه ﴾ ،وقول امرئ القيس :

تطاول ليلُك بالأثمد   ونام الخَلِيُّ ولم ترقُد
وبات و باتت له ليلةٌ   كليلةِ ذي العائر الأذمد
وذلك من نبإٍ جاءني   و خُبِّرتُه عن أبي الأسود

فالتفت في الأبيات الثلاثة ، حيث لم يقل : ليلي، و بِتّ، و جاءك . . . (مدارك التنزيل: ۱/ ۲۰)............ مطلب یہ ہے کہ ﴿ إياك نعبد وإياك نستعين ﴾ میں غائب سے حاضر کی طرف بقصد

التفات عدول کیا گیا ہے، التفات کبھی غائب سے حاضر، کبھی حاضر سے غائب اور کبھی غائب سے متکلم کی طرف ہوتا ہے، جیسا کہ ان آیات کریمہ میں ہے: ﴿حتى إذا كنتم في الفلك و جرين بهم بريح طيّبة﴾ اور ﴿والله أرسل الرياح فتثير سحاباً فسقناه﴾۔ پہلی آیت میں حاضر سے غائب اور دوسری آیت میں غائب سے متکلم کی طرف التفات کیا گیا ہے، امرؤالقیس کے ان اشعار میں بھی صنعت التفات ہے:

تطاول ليلُك بالأَثمد ونام الخَلِيُّ ولم ترقُد
وبات و باتت له ليلة كلَيلةِ ذي العائر الأزمد
وذلك من نَبَإٍ جاءني و خُبِّرتُه عن أبي الأسود

ان اشعار میں تین التفات ہیں: پہلا "ليلك" میں ہے، چونکہ مقام، مقامِ تکلّم ہے، اس لیے بمقتضائے ظاہر "ليلي" کہنا چاہیے تھا مگر شاعر نے بطور التفات "ليلك" کہا۔ دوسرا التفات "بات" میں ہے، اس میں غائب کی طرف التفات ہے، تیسرا التفات "جاء ني" میں ہے، اس میں متکلم کی طرف التفات ہے۔

☆...... سورۃ البقرہ کی آیت کریمہ: ﴿أو كصيّب من السماء فيه ظلمات و رعد و برق ...﴾ کی تفسیر میں انہوں نے فرمایا: ثنّى الله سبحانه و تعالى في شأنهم بتمثيل آخر لزيادة الكشف والإيضاح. شبّه المنافق في التمثيل الأوّل بالمستوقد ناراً، وإظهارَه الإيمانَ بالإضاءة، وانقطاعَ انتفاعه بانطفاء النّار. و هنا شبّه دينُ الإسلام بالصيّب؛ لأن القلوب تحيا به حياةَ الأرض بالمطر، وما يتعلق به من شُبَه الكفار بالظلمات، وما فيه من الوعد والوعيد بالرعد والبرق، وما يصيبهم من الأفزاع والبلايا من جهة أهل الإسلام بالصواعق. والمعنى: أو كمثل ذوي صيّب، فحذف "مثل" لدلالة العطف عليه، و "ذوي" لدلالة "يجعلون" عليه. والمراد: كمثل قوم أخذتُهم السماء بهذه الصفة، فلقوا منها ما لقوا فهذا تشبيه أشياء بأشياء، إلّا أنّه لم يصرّح بذكر المشبّهات، كما صرّح في قوله: ﴿وما يستوي الأعمى والبصير والذين آمنوا و عملوا الصالحات ولا المسيءُ﴾، وقول امرئ القيس:

كأن قلوب الطير رَطباً و يابساً لَدَى وَكْرِها العُنّابُ والحَشَفُ البالي

بل جاء به مطويّا ذكره على سَنَن الاستعارة، والصحيح أن التمثيلين من جملة التمثيلات المركّبة دون المفرّقة. (مدارك: ١/٤١،٤٢)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں منافقین کے حال کی مزید وضاحت کے لیے ان کی ایک اور تمثیل بیان فرمائی ہے، پہلی تمثیل میں منافق کو آگ جلانے والے کے ساتھ، اس کے اظہار ایمان کو روشن کرنے اور عدم انتفاع کو آگ بجھنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ جب کہ دوسری تمثیل میں دین اسلام کو بارش کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، کیوں کہ اسلام سے

دلوں کو حیات ملتی ہے، جس طرح بارش سے زمین کو حیات ملتی اور وہ زرخیز ہوتی ہے اور اسلام سے متعلق کفار کے شبہات کو اندھیروں کے ساتھ، اس میں وعد اور وعید کو گرج اور بجلی کے ساتھ اور مسلمانوں کی طرف سے کفار کو پہنچنے والی گھبراہٹوں، پریشانیوں اور مصائب کو کڑک کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: " أو كمثل ذوي صيّب . . . پھر " مثل " کو جانب معطوف علیہ میں مذکور " مثل " کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور " ذوي " کو بھی حذف کر دیا گیا، کیوں کہ " يجعلون " اس پر دلالت کر رہا ہے۔ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے: ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جن پر آسمان سے زور کی بارش برسے، جس میں اندھیرے بھی ہوں اور گرج اور بجلی بھی اور وہ لوگ اس ڈر سے کہ کہیں صواعق کی گرج دار آواز سے ہلاک نہ ہو جائیں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں تاکہ وہ صواعق کی آواز ہی نہ سن سکیں...... غرض اس آیت کریمہ میں کئی چیزوں کو کئی چیزوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، مگر مشبّہات کا ذکر صراحۃً نہیں کیا گیا، جس طرح اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے: ﴿وما يستوي الأعمى والبصير والذين آمنوا و عملوا الصالحات ولا المسيءُ﴾ " أعمى " اور " بصير " دونوں مشبہ ہیں، پہلے کے ساتھ نیک عمل شخص کو اور دوسرے کے ساتھ بد عمل شخص کو تشبیہ دی گئی ہے اور دونوں مشبہ بہ صراحۃً مذکور ہیں۔ اسی طرح امرؤ القیس کے اس شعر میں بھی ہے:

كأن قلوب الطير رَطباً و يابساً لَدَى وَكْرِها العُنّابُ والحَشَفُ البالي

اس شعر میں " العُنّاب " اور " الحشف البالي " دونوں مشبہ ہیں، اول کے ساتھ پرندوں کے تروتازہ دلوں کو اور ثانی کے ساتھ ان کے خشک اور سوکھے ہوئے دلوں کو تشبیہ دی گئی ہے اور دونوں مشبہ بہ صراحۃً مذکور ہیں۔ غرض اس آیت کریمہ میں مشبہ بہ کو صراحۃً ذکر نہیں کیا گیا، بل کہ استعارہ کے طرز پر مشبّہات کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں اور اس سے پہلی والی آیت دونوں میں مذکور تمثیلیں تمثیلات مرکبہ ہیں، نہ کہ مفرّقہ...... غرض اس نوع کی تفسیر مدارک میں سینکڑوں مثالیں ہیں۔

تفسیر نسفی اور مخالفین اہل سنت! امام نسفیؒ تفسیر میں جا بجا باطل فرقوں مثلاً معتزلہ، کرّامیہ، جہمیّہ، مشبّہہ اور روافض وغیرہ پر رد بھی کرتے ہیں، اگرچہ یہ رد اشارۃً اور اجمالاً ہی ہوتا ہے، بطور نمونہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆...... سورۃ السجدہ کی آیت کریمہ: ﴿خالدين فيها أبداً. . .﴾ کی تفسیر کے ذیل میں جہمیّہ جو جنت و جہنم کے فانی ہونے کے قائل ہیں، پر رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں: هذا يردّ مذهب الجهمية؛ لأنهم يزعمون أن الجنّة والنّار تفنيان. . . (مدارك التنزيل: ۱۳۸۸/۳)

☆...... روافض اور ملحدین کہتے ہیں کہ سورۃ الاحزاب کا کچھ حصہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں موجود ایک صحیفے میں تھا، ان کی ایک بکری نے کھا لیا تھا، سورۃ الاحزاب کی تفسیر میں ان پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وأما ما يحكى أن تلك الزيادة كانت في صحيفة بيت عائشة رضي الله عنها، فأكلتها الداجنُ فمن تأليفات الملاحدة والروافض

(مدارك التنزيل :/١٣٥٨،١٣٥٧).

☆......مشبہہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے جہات ثابت کرتے ہیں، بعض آیات سے وہ استدلال بھی کرتے ہیں، ایسی بات میں وہ ان کا استدلال باطل کرتے ہیں، مثلاً سورۃ البقرہ کی آیت کریمہ: ﴿. . . ثم يعرج إليه في يوم كان مقداره ألف سنة ممّا تعدّون﴾ کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں: ولا تمسّك للمشبّهة بقوله "إليه "في إثبات الجهة ؛لأن معناه :إلى حيث يرضاه ،أو أمره ، كما لا تشبّث لهم بقوله : ﴿إني ذاهب إلى ربّي﴾ ،﴿إنّي مهاجر إلى ربّي﴾ ،﴿ومن يخرج مهاجراً إلى اللّه﴾(مدارك:١٣٥٠/٣)

☆......سورۃ البقرۃ کی آیت کریمہ: ﴿ومن الناس من يقول آمنّا باللّه واليوم الآخر وما هم بمؤمنين﴾ کی تفسیر کے ذیل میں کرامیہ جو کہتے ہیں کہ ایمان اقرار باللسان کا نام ہے، پر رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں: والآية تنفي قول الكرّامية: إن الإيمان هو: الإقرار باللسان لا غير ؛لأنه نفي عنهم اسم الإيمان مع وجود الإقرار منهم، وتؤيّد قول أهل السنّة :إنّه إقرار باللسان و تصديق بالجَنان.(مدارك التنزيل:٣٤/١)

تفسیر نسفی اور اسرائیلی روایات: اسرائیلیات سے متعلق ہم اس کالم میں بارہا گفتگو کر آئے ہیں۔ اسرائیلیات یا اسرائیلی روایات سے مراد وہ قصّے کہانیاں ہیں جو اہل کتاب کے واسطوں سے ہم تک پہنچی ہیں، ان کا شمار قرآن کریم کے ناقابل اعتبار مآخذ میں ہوتا ہے۔ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ سلف وخلف میں بہت کم مفسرین ایسے ہیں جو اپنی تفاسیر کو ان سے آلودہ ہونے سے بچا پائے ہیں۔ امام نسفی اس حوالے سے ذرا نرم گوشہ رکھتے ہیں، چنانچہ عصمت انبیاء اور مسلّمات وعقائد سے متصادم اسرائیلیات کو ذکر کر کے ان پر تو خوب رد کرتے ہیں، البتہ جو اسرائیلیات بے ضرر قسم کی ہیں اور صدق وکذب دونوں کا احتمال ان میں موجود ہے اور عقل وشرع کے بھی متصادم نہیں ہیں تو وہ ان کو ذکر کرتے ہیں اور ان پر تبصرہ کیے بغیر گزر جاتے ہیں، بطور نمونہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆......سورۃ النمل کی آیت کریمہ: ﴿ولقد فتنّا سليمان وألقينا على كرسيّه جسداً ثمّ أناب﴾ کی تفسیر کے ذیل میں حضرت سلیمان علیہ السلام سے متعلق کچھ اسرائیلی قصّے ذکر کرتے ہیں، مگر چونکہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عصمت کے منافی نہیں ہیں، اس لیے ان پر بغیر کوئی تبصرہ کیے ہوئے وہ آگے گذر گئے، اس کے بعد آگے چل کر کچھ قصوں کی طرف جو عصمت انبیاء کے منافی ہیں، اشارہ کر کے ان کو اباطیل یہود قرار دیا، ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:" وأمّا ما يُروى من حديث الخاتم والشيطان ، وعبادة الوثن في بيت سليمان عليه السلام : فمن أباطيل يهود".

☆......سورۃ النمل ہی کی آیت کریمہ: ﴿وهل أتاك نبأ الخصم إذ تسوّروا المحراب إذ دخلوا على داود . . . . . واهدنا إلى سواء الصراط﴾ کی تفسیر کے ذیل میں حضرت داؤد علیہ السلام سے متعلق کچھ اسرائیلی قصے بیان کیے، مگر چونکہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عصمت کے منافی نہیں تھے، اس لیے بغیر کوئی تبصرہ کیے آگے بڑھ گئے، تھوڑا آگے چل کر کچھ ایسے

اسرائیلی قصوں جن میں اوریا کی بیوی پر عاشق ہونے اور اس سے شادی کی غرض سے حیلہ جوئی کرتے ہوئے اوریا کو جہاد میں بھیجنے وغیرہ کا ذکر ہے کی طرف اشارہ فرمایا، یہ قصے چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی شان وعصمت کو داغ دار کر رہے تھے اس لئے ان پر سخت الفاظ میں رد فرمایا اور انہیں انتہائی گھٹیا قرار دیتے ہوئے ایسے شخص کو قابل جلد قرار دیا، ان کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں: وما يحكى أنه بعث مرة بعد مرة أوريا إلى غزوه البلقاء، وأحبّ أن يقتل ؛ليتزوجها فلا يليق من المتسمين بالصلاح من أفناء الناس ، فضلاً عن بعض أعلام الأنبياء . وقال علي رضي الله عنه :من حدثكم بحديث داود عليه السلام على ما يرويه القُصّاص ، جلدته مائة و ستين ، وهو حد الفرية على الأنبياء . . .

تفسیر نسفی کی خصوصیات ایک نظر میں! اس میں کوئی شک نہیں کہ تفسیر نسفی ایک انتہائی بہترین اور عمدہ تفسیر ہے، جس میں جامعیت بھی ہے اور اختصار بھی غیر مخل بالفہم، جس میں بلاغی نکتے اور بدیعی محسنات بھی ہیں اور اعرابی ولغوی مباحث بھی، یہ بہت کم وقت میں قاری کو بہت کچھ دیتی ہے۔ غرض حل قرآن کے لئے یہ ایک اچھی تفسیر ہے، جو ایک مستند اور عبقری صفت عالم کی لکھی ہوئی تفسیر ہے، اگر تفسیر جلالین کی جگہ اس کو داخلِ نصاب کیا جائے تو کیا ہی اچھی بات ہوگی، جب کہ امام نسفیؒ حنفی بھی ہیں اور تفسیر جلالین کے دونوں مفسّر شافعی المسلک ہیں، خیر! مسلک وجہ ترجیح وایثار نہیں، وجہ ترجیح تفسیر جلالین کے مقابلے میں اس کی بیش بہا خوبیاں ہیں، اس میں تفسیر کے ساتھ ساتھ نحو، بلاغت، ادب وغیرہ علوم کی بہترین طریقے سے تمرین واجراء بھی ہو جاتا ہے، جس سے طلبہ کی استعداد وصلاحیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ.

انتقادات: مگر ان سب خصوصیات کے باوجود چند امور جو تفسیر کے مطالعے کے دوران نظر آئے، قابلِ نقد ہیں، کچھ ان میں سے درج ذیل ہیں:

☆...... ایک قابل نقد امر تو یہ ہے کہ امام نسفیؒ نے امام زمخشریؒ کی تفسیر کشاف سے تعبیرات ومضامین میں بہت زیادہ استفادہ کیا، مگر اس کا حوالہ انہوں نے کتاب کے کسی حصے میں نہیں دیا، اس پر شروع میں ہم تفصیلی کلام کر چکے ہیں۔

☆...... بعض آیت کریمہ کی تفسیر انہوں نے باطل روایات کی بنیاد پر کی، مثلاً سورۃ الاحزاب کی آیت کریمہ: ﴿ وإذ تقول للذي أنعم الله عليه وأنعمت عليه . . . وإذا قضوا منهن وطرا وكان أمر الله مفعولاً ﴾ کی تفسیر میں انہوں نے ایک آیت ذکر کی، جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب بنت جحشؓ کو دیکھا تو آپ ﷺ کے دل میں ان کی محبت پیدا ہوگئی اور آپ ﷺ نے یہ الفاظ کہے: " سبحان الله مقلب القلوب "، کیوں کہ آپ ﷺ کے دل میں ان کی طرف پہلے رغبت نہیں تھی، مگر اس بار ان کو دیکھا تو رغبت ہوگئی اسی لیے آپ ﷺ نے " سبحان الله مقلب القلوب " کے الفاظ فرمائے۔ حضرت زینبؓ نے یہ ماجرا حضرت زیدؓ کو سنایا تو حضرت زیدؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: میں زینب سے جدا ہونا چاہتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہارے دل میں اس کے متعلق کوئی شک ہے؟ انہوں نے کہا: واللہ! ایسی کوئی بات نہیں، مگر ان کا خاندانی شرف اور اعلیٰ نسب میرے لیے

پریشان کن اور باعث اذیت ہے، آپ ﷺ نے انہیں فرمایا: أمسك عليك زوجك ﴿واتق الله﴾ فلا تطلّقها.

اس کے بعد آگے جاکر ﴿و تخفي في نفسك ما الله مبديه﴾ کی تفسیر کے ذیل میں امام نسفیؒ نے فرمایا: أي: تخفي في نفسك نكاحها إن طلقها زيدٌ، وهو الذي أبداه الله تعالى ، وقيل : الذي أخفى في نفسه :تعلق قلبه بها ومودّة مفارقة زيد إيّاها . یعنی: آپ ﷺ اپنے دل میں یہ بات چھپا کر رکھے ہوئے تھے کہ زید ان کو طلاق دے دے تو میں اس سے نکاح کرلوں اور اللہ تعالیٰ کو یہ بات ظاہر کرنا منظور تھی۔ایک قول یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جو بات دل میں چھپا کر رکھی تھی وہ حضرت زینبؓ سے محبت اور زید کے ان کو طلاق دینے کی خواہش تھی۔(مدارک التنزیل:۳/۱۳۷۴)

آیت کریمہ کی یہ تفسیر جس قصے اور روایت پر ہے اس کا راوی عبدالرحمن بن زید بن اسلم ہے جو کہ متّہم بالکذب ہے اور اس پر غرائب اور موضوعات کی روایت کا الزام ہے۔حافظ ابن حجرؒ قتادہ کی روایت ذکر کرنے کے بعد اس پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:ووردت آثار أخرى ، أخرجها ابن أبي حاتم والطبري ، ونقلها كثير من المفسّرين ، لا ينبغي التشاغل منها.(فتح الباري:۸/ ۴۲۵) حافظ ابن کثیرؒ نے بھی امام ابن ابی حاتمؒ اور امام طبریؒ کی تخریج کیے ہوئے آثار پر جو انہوں نے بعض اسلاف سے نقل کیے ہیں، یہی تبصرہ فرمایا ہے۔(تفسیر ابن کثیر :۴/ ۲۲۵)

☆...... سورۃ التوبہ کی آیت:﴿ومنهم من عهد الله لئن اتٰنا من فضله . . . .بما أخلفوا الله ما وعدوه و بما كانوا يكذبون﴾ کا شان نزول ایک بدری صحابی حضرت ثعلبہؓ بن حاطب کی روایت کو قرار دیا۔(مدارک :۱/۲۳۸) اس قصے اور روایت کی بابت اس کالم میں ہم کئی مرتبہ تفصیلی کلام کرچکے ہیں،جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ قصہ اور روایت نہ سنداً صحیح ہے اور نہ عقلاً۔یہ قصہ تین حضرات سے منقول ہے:حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے،جن سے یہ معان بن رفاعہ عن علی بن یزید عن القاسم بن عبدالرحمن کے طریق سے مروی ہے،اس سند میں علی بن یزید متروک راوی ہے،امام بخاریؒ اور امام عقیلیؒ نے اسے ''منکرالحدیث''،امام نسائیؒ نے ''ليس بثقة '' اور '' متروك ''قرار دیا ہے اور حافظ ذہبیؒ نے فرمایا:ضعّفوه و تركه الدار قطني .(التاريخ الكبير:۶/۳۰۱،الضعفاء الكبير :۳/۲۵۶، كتاب المجروحين من المحدثين والضعفاء والمتروكين:۳/۳۶)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی یہ قصہ منقول ہے اور جس سند کے ساتھ ان سے یہ قصہ منقول ہے، محدثین کے نزدیک وہ مینگنی کے برابر بھی نہیں، کیوں کہ یہ سند ''مسلسل بالعوفیین'' ہے اور وہ سب کے سب ضعیف ہیں۔

امام حسن بصریؒ تیسرے شخص ہیں جن سے یہ قصہ منقول ہے،ان سے یہ قصہ اس سند کے ساتھ منقول ہے: ابن حميد قال : حدثنا سلمة عن ابن إسحاق عن عمرو بن عبيد عن الحسن ، یہ سند انتہائی ضعیف ہے،جس میں کئی علتیں ہیں:(۱) ارسال (۲) عمرو بن عبید ابوعثمان بصری معتزلی ہے جو تباہ حال ہے،محدثین نے اس کو متروک اور جھوٹ بولنے والا قرار دیا ہے۔(ميزان الاعتدال :۳/ ۲۸۰ ـ ۲۸۳، تهذيب التهذيب :۸/ ۷۰ـ ۷۵، كتاب المجروحين :۲/۶۶)

یہ تو اس قصے اور روایت کا حال ہے، جس کو بنیاد بنا کر امام نسفیؒ نے امام زمخشریؒ کی اتباع میں ان آیتوں کی تفسیر کی ہے۔

☆.....سورۃ الطور کی آیت کریمہ:﴿ الذین یجتنبون کبائر الإثم والفواحش إلا اللمم... ﴾ کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا: ... ﴿إلا اللمم﴾ أي: الصغائر، الاستثناء منقطع؛ لأنه لیس من الکبائر والفواحش، وهو: کالنظرة واللمسة والغمزة. (مدارك التنزیل: ۱۷۱۸/۳) یعنی "لمم" سے مراد صغائر ہیں اور یہ استثناء منقطع ہے، کیونکہ "لمم" کبائر وفواحش میں داخل نہیں۔ "لمم" کی مثال جیسے غیر محرم کو دیکھنا، چھونا اور آنکھ مارنا..... نظرة، لمسة اور غمزة کو لمم (صغائر) میں داخل کرنا محل نظر ہے، کیوں کہ ان تینوں کے متعلق وعید آئی ہے جو ان کے کبیرہ ہونے کی نشانی ہے۔ مثلاً: ﴿قل للمؤمنین یغضوا من أبصارهم...﴾، ﴿ولا یبدین زینتهن إلا لبعولتهن﴾، ﴿یعلم خائنة الأعین وما تخفي الصدور﴾ یہ آیات کریمہ نظر اور غمز کی حرمت پر دال ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:" یا علي، لا تُتبع النظرة النظرة، فإنما لك الأولی، ولیست لك الأخرة". (رواه أبو داود والترمذي عن بریدة، کذا في نیل الأوطار: ۱۱۱/۶) ۔ ایک اور حدیث میں ہے:"ما من مسلم ینظر إلی محاسن امرأة، ثم یغض بصره إلا أخلف الله له عبادة، یجد حلاوتها في قلبه"؛(رواه أحمد)۔ حدیث قدسی ہے:"النظرة سهم من سهام إبلیس، من ترکها من مخافتي، أبدلته إیماناً یجد حلاوته في قلبه". (رواه الطبراني والحاکم عن ابن مسعود، کذا في النفحات السلفیة شرح الأحادیث القدسیة: ص ۱۰۳) یہ احادیث بھی ان گناہوں کے کبیرہ ہونے پر دال ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: رد المحتار: ۳۶۶/۶،۳۶۷، الکتاب مع اللباب: ۱۶۲/٤، القوانین الفقهیة: ص ۱۹۳۔۱۹٤، مغني المحتاج: ۱۲۸/۳ وما بعدها، کشف القناع: ۹/۵ ۔ ۱۵، المغني: ۵۵۲/٦ ۔ ۵٦۳، أحکام القرآن لابن العربي: ۱۳٦۲/۳، أحکام القرآن: ۳ /۳۱۸، الشرح الصغیر: ۲۸۸/۱ وما بعدها.

بہر کیف یہ چند فروگذاشتیں ہیں، جو لا تعدم الحسناء ذاماً کے مصداق نہایت معمولی ہیں، کتاب کے باقی محاسن اور خوبیوں کے مقابلے میں یہ قابلِ ذکر نہیں۔

پیش نظر مطبوعہ نسخہ: تفسیر نسفی برصغیر پاک وہند، بیروت اور دیگر اسلامی شہروں میں کئی بار چھپ چکی ہے، ہمارے پیش نظر نسخہ "دار القلم اللبنانیہ" کا فوٹو ہے، جسے قدیمی کتب خانہ کراچی نے چھاپا ہے، طباعت کا معیار درمیانہ، جلد بندی مضبوط اور کاغذ ہلکا ہے۔ اصل لبنانی نسخہ میں سلیقہ مندی کی گنجائش ہے، پروف خوانی کی غلطیاں بھی بکثرت ہیں۔

لبنانی نسخے کے شروع میں دو صفحات کا مقدمہ ہے، جو جمہوریہ لبنان کے "دار الفتویٰ" میں دفتر مذہبی امور کے سربراہ شیخ قاسم شمالی رفاعی نے تحریر کیا ہے، جب کہ اس ایڈیشن کی تیاری میں نگرانی، مراجعت اور ضبط وترتیب کا کام شیخ ابراہیم محمد رمضان نے سرانجام دیا ہے۔ یہ نسخہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

☆.....☆.....☆

ایمان، جان سے زیادہ عزیز ہونا چاہئے

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مجھے صرف چند باتیں عرض کرنی ہیں ایک تو یہ کہ اگر میں آپ سے کوئی معاہدہ کرتا تو یہ کرتا کہ آپ اس احساس وشعور کو زندہ رکھیں کہ ایمان جان سے پیارا ہے اور ہم یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ بچہ کی جان سے، اس کی صحبت سے اس کا ایمان زیادہ عزیز ہے، ایمان زیادہ قیمتی ہے، اس کیلئے میں آپ کے سامنے قرآن کریم کی دو آیتوں سے استدلال کرتا ہوں اور جب بھی پڑھتا ہوں مجھے حیرت ہوتی ہے اور وہ حیرت ختم نہیں ہوتی، لیکن مجھے اندیشہ بلکہ میرا احساس یہ ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس سے صحیح نتیجہ نکالا ہوگا۔ اسلاف کرامؒ اور مفسرین عظام کا ذہن بے شک ان چیزوں کی طرف گیا ہوگا، جہاں ہمارا نہیں جاسکتا، لیکن آج کے پڑھنے والے بہت کم یہ نتیجہ نکالتے ہیں، قرآن مجید کی سورۂ کہف میں آخر یہ قصہ کیوں بیان کیا گیا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک لڑکے کی جان لے لی اور وہ بھی ایک اولوالعزم اور ایک عظیم الشان پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی اور رفاقت میں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے جب پوچھا کہ آپ نے بچہ کے ساتھ یہ کیا معاملہ کیا؟ اس کا کیا جرم تھا؟ اور کیا وہ جرم ایسا تھا کہ اس کی جان لے لی جائے؟ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ اس کے ماں باپ دونوں صاحب ایمان اور نیک تھے اور یہ بچہ فتنہ بننے والا تھا، اگر یہ زندہ رہ جاتا تو اپنے ماں باپ کے ایمان کیلئے خطرہ بنتا تو میں نے اس لئے ان کو اس خطرہ سے بچالیا اور اس کی جان لے لی کہ اللہ اور اولاد دے گا۔

آج کہیں پوری دنیائے اسلام میں بڑی سے بڑی اور شرعی حکومت بھی اس پر عمل نہیں کرسکتی، آپ سب جانتے ہیں کہ اس پر عمل کرنا بالکل حرام اور ناجائز ہے کہ محض اس خطرے سے کہ یہ بچہ کبھی فتنہ بن جائے گا (اور بہت سے بچے فتنہ بن رہے ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں) اس کی جان لینے کی اجازت نہیں، اور جان لینا تو جان لینا ہے کوئی اور بہت بڑی سزا معصومیت کی حالت میں نہیں دی جاسکتی اور یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ پھر قرآن کریم نے قیامت تک کے لئے اس قصہ کو سورہ کہف میں داخل کرکے اسے زندہ جاوید کیوں بنادیا؟ کہ یہ قیامت تک پڑھا جائے گا، تو اس نے ایسا اس لئے کیا

تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ ایمان کی یہ قیمت ہے، اگر چہ آج اس پر عمل نہیں ہو سکتا اور تشریعی طور پر اس پر عمل کرنا حرام بھی ہے اور قتل ناحق ہے لیکن اللہ تعالیٰ اسے قرآن مجید کی سورہ کہف میں بیان فرما رہا ہے اسے ایک پیغمبر اور اس کے رفیق کا (جن کا کم سے کم درجہ اولیاء اللہ کا ہوگا) فعل بتایا جا رہا ہے آخر اس کی حکمت کیا ہے؟ حکمت یہی ہے کہ ہم آپ سوچیں کہ ایمان وہ قیمتی چیز ہے کہ اس کے لئے حضرت خضر علیہ السلام (نے جو بڑے فقیر بڑے عارف باللہ اور بڑے صاحب بصیرت اور مقبول عند اللہ تھے) انہوں نے یہ کام کیا کہ اس بچہ کی جان لے لی، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ سنایا اور قرآن مجید میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کرادیا، تا کہ پڑھنے والے یہ سمجھیں کہ ایمان اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے لئے جو چیز خطرہ بننے والی ہے اس خطرہ کو بھی دور کرنا چاہئے، چاہے وہ کیسی ہی پیاری اور عزیز کیوں نہ ہو، مگر ہم لوگ اس طرح نہیں سوچتے، قرآن کریم کا یہ اعجاز اور الہامی نکتہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس قصہ میں بیان فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہ السلام ایک بستی میں گئے اور انہوں نے دیکھا کہ ایک دیوار مسمار ہونے والی ہے اس موقع پر وہ زبان حال سے گویا کہہ رہے تھے کہ ہم پردیسی ہیں اور ہماری ضیافت ہونی چاہئے اور زبان قال سے بھی جیسا کہ قرآن مجید سے اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پوری بستی میں کسی نے خبر نہیں لی اور کھانا پیش نہیں کیا اور وہ بھوکے رہے مگر دیوار جو گر رہی تھی، حضرت خضر علیہ السلام اس کے سنبھالنے میں لگ گئے اور آپ جانتے ہیں کہ گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ کہاں سے مسالہ لائے اور کتنی محنت کی ہوگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا، عجب تضاد ہے، جنہوں نے کھانے تک کی خبر نہیں لی، ہم سے کھانے کو نہیں پوچھا، ان کا کہاں سے یہ حق تھا اور کیا احسان تھا کہ آپ نے اس دیوار کو جس کی مرمت میں وہ مزدور لگاتے، پیسے خرچ کرتے اور خود توجہ کرتے، آپ نے اس دیوار کو سنبھال دیا تو انہوں نے کہا، یہ دیوار یتیم بچوں کی تھی، جن کا باپ نیک تھا، یہ دیوار اگر گر جاتی تو جو خزانہ اندر دبا ہوا تھا وہ کھل جاتا، سامنے آجاتا اور لوگ لوٹ کر لے جاتے ، اور ان غریبوں کو غربت کا سامنا کرنا پڑتا اور ان کے پاس کچھ نہ رہتا۔ ایک طرف جان لی، ایمان کے خطرے سے اور ایک طرف دیوار سنبھالی ایمان کی فضیلت کی وجہ سے، یعنی وہ خود بھی نہیں بلکہ ان کے باپ نیک تھے، معلوم نہیں ان کے انتقال کو کتنا زمانہ ہو گیا تھا۔

لیکن حضرت خضر علیہ السلام نے اس ایمان کی اتنی قیمت جانی کہ اس دیوار کو سنبھالا اور اس کو کھڑا اور ٹھیک کر دیا اور وہ خزانہ دبا رہا۔ یہ دونوں واقعہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سورت میں اوپر نیچے بیان کئے تا کہ آپ کو ایمان اور کفر کا فرق معلوم ہو، ایک طرف ایمان کی یہ قیمت کہ جو بچہ خطرہ بننے والا تھا اس کو ختم کر دیا اور ایک طرف ایمان کی یہ قیمت کہ جن کا باپ نیک تھا، ابھی ان کا وقت نہیں آیا تھا، ابھی وہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے اور وہ دو یتیم بچے تھے ان کا باپ چونکہ صاحب ایمان تھا اور نیک تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ایمان کی قدردانی میں دیوار سنبھالنے کا انتظام فرمایا اور الہام کے ذریعہ حضرت خضر علیہ السلام نے وہ دیوار سنبھال لی۔

ایمان کو جان پر مقدم سمجھنا ایمان کا تقاضا ہے: بس میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے آپ ایمان کی قیمت سمجھئے، اب یہ حکم نہیں ہے کہ جس کو آدمی قابل خطرہ سمجھے اس کو اس طرح ختم کردے بلکہ بہتر یہ ہے کہ اگر خطرہ سمجھے تو اس کو اس دیوار کی طرح سنبھالے، جو گر رہی تھی، ویسے ہی اپنی اولاد کو اور آئندہ آنے والی نسل کو گرتی ہوئی دیوار کی طرح کھڑا کردے، اس کو مضبوط بنائے، مستحکم کرے، مسئلہ صرف اتنا ہے کہ اگر ہمارے ذہن اور ہمارے عقیدے نے اس کو قبول کرلیا کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے تو پھر علاج ومعالجہ اور کپڑے بنانے اور اس کی پوشاک کا خیال کرنے اور پھر آگے بڑھ کر اعلیٰ تعلیم دلانا ان سب سے زیادہ ضروری یہ ہوگا کہ ان کے دل میں ایمان بٹھایا جائے۔ ان کے علاج ومعالجہ سے کپڑے بنانے سے، انہیں دعائیں دینے سے، اور انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہونے سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کے ایمان کا تحفظ کرے، اور ایسا انتظام کرے کہ ایمان جانے نہ پائے۔ آخری بات میری طرف سے یاد رکھئے کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے۔

﴿یاأیها الذین آمنوا قوا أنفسکم وأهلیکم نارا﴾ ''اے ایمان والو! اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔''

دوزخ کی آگ سے کس طرح بچاؤ گے؟ ایمان کے ذریعے سے بچا سکو گے، سب سے پہلا اور اہم ترین فریضہ ہے اپنی آئندہ نسل کے ایمان کی حفاظت کا سامان کرنا اور اسے ان جھگڑوں، ناکوں اور ان ٹھکانوں سے بچانا یہاں تک کہ ان تعلیم گاہوں سے بچانا، جہاں ایمان کا خطرہ ہو اور اس کا بدل مہیا کرنا کہ بے علم بھی نہیں رہ سکتے اس دنیا میں نہ پہلے اس کا جواز تھا اور نہ اب جواز ہے، تو تعلیم ضروری ہونی چاہئے لیکن تعلیم اس طرح نہیں ہونی چاہئے کہ ایمان خطرے میں پڑ جائے پھر چاہے آدمی آسمان پر اڑے اور دریا پر چلے اور سائنس میں اور علم جدید میں اور دوسرے فنون میں کتنی ہی ترقی کرے اور بڑے سے بڑا سرمایہ دار قارون وقت بن جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں اور اس کے پیغمبروں کے یہاں اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کی حقیقی قیمت سمجھنے، اس کو دنیا کی ہر چیز، ہر دولت پر، ہر نعمت پر، ہر ترقی پر، ہر لذت پر اس کو ترجیح دینے کی توفیق عطا فرمائے، کہ اپنے ایمان کی بھی فکر کریں اور اپنی اولاد کے ایمان کی بھی فکر کریں اور ہم پوری امت مسلمہ کے ایمان پر قائم رہنے کی فکر کریں۔ سب سے بڑھ کر نسل کشی عقیدے اور ایمان کی نسل کشی ہے کہ یہ نسل رہے اور ایمان نہ رہے دین کا امتیاز اور دین کا فرق نہ رہے اور باقی تہذیب اور کلچر اور رسم الخط اور دوسری چیزیں تو اپنی جگہ پر ہیں اس کا پورا ایک منصوبہ تیار ہے کہ لوگ اسلام پر قائم نہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ اس ملت اسلامیہ کو اس دنیا میں اپنے تمام تشخصات کے ساتھ اپنے تمام امتیازات کے ساتھ سب سے بڑھ کر دین وایمان اور عقیدے کے ساتھ حمیت دینی اور حمیت اسلامی کے ساتھ اور نہ صرف یہ کہ ایمان کے باقی رہنے کی ضمانت کے ساتھ اور اس کے اسباب وذرائع کی موجودگی کے ساتھ بلکہ اس کو ترقی کرنے اور دنیا کے دوسرے اسلامی ملکوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے اور یورپ وامریکا تک اسلام کا پیغام پہنچانے، مسلمان بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے مدد فرمائے۔ (آمین) ☆

اسلام اور تعلیم نسواں

محمد خلیل اللہ

اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہوسکتا ہے کہ دین اسلام تعلیم نسواں کا مخالف ہے۔ کفار کے تسلط اور بے دینی کے سیلاب میں جس طرح بہت سی باتیں گڈ مڈ ہوگئیں وہیں دینی اقدار کی بھی من مانی تشریح کی جارہی ہے۔ بنیادی طور پر ہمارا معاشرہ جن فکری تضادات کا شکار ہے اس کی جڑ میں افراط وتفریط کے عوامل کارفرما ہیں۔ بعض لوگ دین اسلام کو اپنے مخصوص دائرہ فہم اور اپنی جغرافیائی حدود کے اندر رکھ کر اس سے آگے نکلنے کو سرحد اسلام سے تجاوز سمجھتے ہیں۔ عموماً اس قسم کے لوگوں میں تحزّب پسند، روایت پسند، تحقیق واعتدال سے عاری تحریکیں اور افراد شامل ہیں۔ یہ لوگ تعلیم نسواں کے حق میں بھی نہیں ہوتے اور بعض لوگ وہ ہیں جو مذکورہ نقطہ نظر کے حاملین کے مخالفت میں زچ ہوکر افراط کی راہ اختیار کرتے ہوئے لادینی طرز تعلیم کے جواز کے حق میں دلائل دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ لوگ احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ کفریہ طاقتوں کی بودوباش، طرز زندگی اور افکار ونظریات سے ذہنی طور پر شکست خوردہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ قرآن کے منہج حیات سے متاثر ہوکر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کیوں نہ اسلام کے ڈھانچہ کو اٹھا کر ان کی پسند کے مطابق ڈھال دیا جائے، خدا بھی ناراض نہ ہوں، اور وہ بھی راضی رہیں! ان لوگوں میں عصر حاضر کے متجدد دین اور دوسرے مذہب بیزار ماڈرن تحریکیں اور افراد شامل ہیں۔

اسی افراط وتفریط کا نتیجہ ہے کہ تعلیم نسواں جیسا عام اور سادہ مسئلہ بھی گنجلک اور پیچیدہ ہوکر رہ گیا ہے۔ پہلا طبقہ سرے سے خواتین کی ہر قسم کی تعلیم کا مخالف ہے۔ وہ عورت کو صرف گھر کی چاردیواری میں محدود ومحبوس رکھ کر صرف اپنے مقاصد اور خدمت کے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہے، خواہ گھر کی ملکہ دینی تعلیمات کے ابجد سے بھی واقف نہ ہو، اور خواہ وہ معاشرتی ضرورت کی حد تک معلومات عامہ سے بھی انجان ہو۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اس ماحول کے بچے عموماً دین ودنیا کے آداب سے واقف نہیں ہوتے اور معاشرے کا صحیح فرد نہیں بن پاتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف ضد

میں آکر اور معروضی حالات سے متاثر ہو کر بعض لوگ خواتین کے لئے اسکول اور کالج جانا سائنس اور پانی کا مسئلہ بنا دیتے ہیں۔ ماڈرن دنیا کے تقاضوں کو سامنے رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں، خواہ اس کے لئے دینی تقاضوں کی قربانی دینی پڑ جائے۔!

درحقیقت یہ دونوں نظریئے اسی مخصوص غیر معتدلانہ سوچ پر قائم ہیں جو ان کی رگ وخون میں دوڑ رہی ہے۔ دین اسلام ایک معتدل اور متوسط دین ہے۔ اس کے اندر ایسی لچک ہے کہ اس کے برگ وبار کو کبھی خزاں نہیں اور ایسی صلابت اور مضبوطی ہے کہ لوہا اس کے آگے پگھل جائے، لہٰذا پہلے طبقہ کی بناء پر اسلام کی لچک کو کوئی گھن لگنے کا امکان ہے اور نہ ہی دوسرے طبقہ کی بے وجہ ناراضگی اور شکوہ پر دین اسلام کی صلابت کو کوئی زنگ لگ سکتا ہے۔

دین اسلام تعلیم نسواں کی نہ صرف یہ کہ ترغیب دیتا ہے، بلکہ اس کا علم بردار بھی ہے۔ قرآن کریم کی آیات مبارکہ میں جہاں مردوں کو مخاطب کیا گیا ہے وہاں عورتوں کو بھی مخاطب کیا گیا ہے اور ظاہری بات ہے کہ قرآن کا تقاضا ہے کہ اس کا خطاب سمجھنے کے لئے علم اور اہلیت ہو۔ ورنہ پھر مخاطب بنانے کے کیا معنی! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے زیادہ علم وآگہی کا زعم کس کو ہوسکتا ہے جن کی علمی روایات سے گلشن حدیث مہک رہا ہے۔ صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرویات کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد کئی مسائل میں فیصلہ کے لئے حضرات صحابہ کرام حضرت عائشہؓ کی طرف رجوع فرماتے تھے اور آپؓ کا قول قولِ فصیل ہوتا تھا! گویا حضرت عائشہؓ عالمہ بھی تھیں اور معلّمہ بھی اور تاریخ اسلام ایسی نامور خواتین کی داستانوں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے علم کے میدان میں اپنی علمی قابلیت کا لوہا منوایا اور اس میدان میں وہ مردوں کو بھی شکست اور مات دے گئیں۔

فقہ کے میدان میں علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی سے شاید ہی کوئی ناواقف ہو، جن کی ''بدائع الصنائع'' نامی شہرۂ آفاق کتاب فقہ حنفی کی بے نظیر کتاب ہے۔ اس کتاب کے بارے میں فقہ کی کتابوں میں دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ مصنف مذکور نے اپنی کتاب ''البدائع'' اپنے استاد اور شیخ کی کتاب ''التحفہ'' کی شرح کے طور پر تصنیف کی۔ جب یہ ان کے سامنے پیش کی تو انہوں نے شرح دیکھ کر خوشی اور انعام کے طور پر اپنی بیٹی فاطمہ کا نکاح ان سے کر دیا اور یہ فاطمہ کوئی عام عورت نہیں تھی بلکہ فقیہہ تھی۔ یعنی دینی مسائل اور احکام کی گہرائیوں سے واقف تھی اور جب ان کے والد بزرگوار علاؤ الدین سمرقندی کے پاس کوئی استفتاء آتا تھا تو اس کے جواب اور فتویٰ میں جہاں ان کے والد (جو خود فقیہہ ملت تھے) اور ان کے شوہر علامہ کاسانیؒ کے دستخط ہوتے تھے وہاں فاطمہ فقیہہ ملت کے دستخط بھی ثبت ہوتے تھے۔!

شریعت اسلامیہ میں ہر چیز کی طرح تعلیم نسواں کے لئے بھی اصول وضوابط ہیں۔ اسلام ان کی رعایت کی تاکید کرتا ہے جس میں حجاب، شرم وحیا جیسے امور سرفہرست ہیں، قدیم طرزِ تعلیم نسواں میں محلّہ کی ایک تعلیم یافتہ خاتون آس پاس کی بچیوں کو جہاں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتی تھی وہاں تربیت اور امورِ خانہ داری جیسے اہم کام بھی سکھاتی تھی۔

اس طریقے سے ایک بہترین گھریلو خاتون تیار ہو جاتی تھی جو اپنا منصب وفریضہ اچھی طرح پہچان لیتی تھی اور امورِ خانہ داری بھی بہتر طریقے سے نبھا لیتی تھی۔ لیکن آج کل تعلیمی اداروں میں تعلیم کے ساتھ تربیت کا بے حد فقدان ہے جو کہ ایک لازمی عنصر ہے۔ اس کے بغیر کائنات کی زینت میں حسن کامل کے شگوفے نہیں پھوٹ سکتے۔ جس طرح عورت کو علم کی روشنی سے دور رکھ کر تاریکیوں میں دھکیل کر چوپائے کی مانند اس سے کام لینا غلط ہے، بالکل اسی طرح عورت کو شمع انجمن بنا کر ڈگریوں کے لئے رسوا کرنا اور آزادی کے نام سے اسے اخلاقی گراوٹ میں مبتلا کرنا اس کی فطرت کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اسلام بہرحال دونوں زاویہ خیال کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور یہ دونوں طریقے اسلام سے متصادم اور دین کو صحیح نہ سمجھنے کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں۔

ماڈرن دنیا کے اعصاب پر تعلیم نسواں کا جو خبط سوار ہے، انہیں جس سمت دھکیل رہا ہے اس عواقب کو دیکھتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر وہ یہ امید رکھیں کہ اسلام تعلیم نسواں کے لئے وہی نظریہ اور آئیڈیا دے تو شاید یہ ممکن نہ ہو۔ جدید دور کے تقاضے میں اگر یہ بات شامل ہے کہ خواتین کو اسی ماحول کے ہم آہنگ کوئی بعینہ متبادل اسلامی ماحول مل جائے اور تعلیم کے وہی اصول ہوں جو انکل سام کے بھگوڑوں کے تعلیمی اداروں کی نہروں سے فیضیاب اور ان کے پھلوں کا رس چوس چکا ہو تو یہ بات کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتی کیونکہ وہاں کے تعلیمی اصول سیکولرازم (مذہب بیزاری) کے اصول پر مبنی ہیں۔ جبکہ اسلام کے نظام تعلیم کی اساس اور بنیادی مذہبی اصولوں کی پاسداری کے ساتھ دین ودنیا کی تعلیم ہے۔

قدیم نظام تعلیم میں مردانہ اور زنانہ کی تعلیم میں جہاں دائرہ شریعت کی پاسداری ایک لازمی جز کا درجہ رکھتی تھی وہاں ضرورت اور قابلیت کا معیار بھی بطور خاص مدنظر ہوتا تھا۔ جس کی بنا پر معاشرہ میں شرح خواندگی صرف کماً زیادہ نہیں تھی بلکہ ضرورت اور قابلیت کے رہنما اصولوں کی پابندی کے بل بوتے پر کیفاً بھی تعلیمی گراف بلند رہتا تھا۔ معاشرتی ضرورت بھی پوری ہو جاتی تھی اور ہر شعبہ کو قابل اور ماہر رجالِ کار مہیا ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صدی قبل سے رواں صدی کی تعلیمی کیفیت کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ روایتی انداز میں تعلیم یافتہ خاتون کا تعلیمی معیار اگر میٹرک کے مساوی ہوتا تھا تو وہ آج کل کے گریجویٹ سے کہیں زیادہ بلند ہوتا تھا اور باقی صفات مثلاً شرم وحیاء، غیرت وحمیت اور تربیت کا اعلیٰ معیار اس کے علاوہ ہیں۔

اس کے مقابلے میں آج کل تعلیم بالخصوص پاکستان میں اس کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ دین واسلام، غیرت وحیا اور تربیت کا فقدان تو اپنی جگہ، یہاں تو تعلیم کے لئے کوئی لائحہ عمل نہیں ہے۔ اندھیر نگری کی مانند قوم کی بیٹیاں ایک غیر معلوم منزل کی طرف بڑھ رہی ہیں، نہ تو تعلیم کی ضرورت کو مدنظر رکھا جا رہا ہے اور نہ قابلیت کو۔ گھر کی مالکہ کو گھریلو زندگی سے متعلق اشیا کی تعلیم اور اس میں مہارت کی ضرورت ہے لیکن یہاں مردوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے

شوق نے صنف نازک کو پٹڑی سے اتار دیا ہے۔ اور ہر ایک کو ڈاکٹر بننے کا شوق خواہ قابلیت ہو یا نہ ہو مگر ایک چیز ضرور ہو، سفارش، رشوت......!

جب نظام تعلیم سے دین وشریعت کا عنصر نکالا گیا تو اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں کہ تعلیمی اداروں کی مذہبی اور اخلاقی پستی کا کیا عالم ہو چکا ہے! جن ماؤں کی کوکھ سے جنم لینے والے بچے فاتح اور غالب بن کر نکلنے کا عزم رکھتے تھے آج وہ بانجھ ہو چکی ہیں وہ بچے اب پیدائشی طور پر ذہناً مفتوح ومغلوب بن کر دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں۔ جن ماؤں کی گود میں پلنے والے بچے کبھی محمد بن قاسم اور صلاح الدین ایوبی کی صورت میں نظر آتے تھے آج ان ماؤں کی لوریوں میں شجاعت وبسالت کے نغمات کے بجائے انگریزی پویمز کے سر اپنا اثر دکھا رہے ہیں اور جب پھر ساتھ ساتھ ضرورت اور قابلیت کا معیار بھی کھرچ کر صاف کر دیا گیا تو معاشرہ میں غیر ضروری افراد بوجھ بن گئے اور ضرورت مند شعبوں کو صحیح رجالِ کار کی فراہمی معطل ہو کر رہ گئی۔

آج اگر یہ بات کہہ کر اہل اسلام کو مطعون کیا جا رہا ہے کہ اسلام اور شریعت کے دائرہ میں رہ کر تعلیم نسواں کا خواب پورا نہیں ہو سکتا تو اس پر جزبز ہونے کے بجائے دوٹوک الفاظ میں کہا جائے کہ جی ہاں! اسلام ایک دین خالص ہے جس میں بے راہ روی کی پیوندکاری سعی لاحاصل ہے۔ البتہ اسلام کے پاس اپنا ایک مربوط نظام تعلیم موجود ہے اور وہ ہر لحاظ سے جامع ہے۔ اگر اس دائرہ میں تعلیم نسواں کا نظم ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ خواتین دین ودنیا کے علم سے خداوند قدوس کی رضا کے عین مطابق بہرہ آور ہوں اور ماڈرن طریقہ سے کئی زیادہ بہتر نتائج برآمد ہوں......!

جی ہاں! تاریخ اسلام کا عروج کا دور اس کی جامعیت کا برہان وعکاس ہے۔ اگر کوئی عمل کرے تو تاریخ دوبارہ اپنے آپ کو دہرا سکتی ہے اور عمل نہ کرنے والوں کے پاس ہزار بہانے ہیں۔ ہمیں اب اپنا نظام تعلیم از سر نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ جس میں دین حنیف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ضرورت اور قابلیت کے معیار کو لازماً مدنظر رکھنا ہوگا۔ نہ تو ہمیں قوم کی بیٹیوں کو علم کی روشنی سے دور رکھنا ہوگا اور نہ ہی علم کے نام پر دین و مذہب سے دستبرداری اختیار کرنا ہوگی۔ لہٰذا اگر تعلیم کے نام پر اسکول وکالج کو بازار حسن بنا دیا جائے، مرد وزن کے اختلاط کو گوارا کر لیا جائے، بے حیائی، فحاشی وعریانی کے اسباب سے چشم پوشی کی جائے، اخلاق واقدار کی بیخ کنی کی جائے اور پھر ساتھ ساتھ اس ملغوبہ پر اسلامیت کا لیبل چسپاں کرنے کی خواہش یا کوشش ہو تو یہ مذہب اور دین کو کھلونا بنا دینے والی بات ہے۔ اگر کوئی صرف اس بنا پر یہ کہتا ہے کہ اسلام تعلیم نسواں کا مخالف ہے تو اس سے بڑا جھوٹ اور بہتان کیا ہو سکتا ہے؟ کیا یہ عقل کو گالی دینے کے مترادف نہیں......؟؟؟

☆☆☆

امت مسلمہ کے خلاف یہودی سازشیں

محمد عمر عثمانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں اوس وخزرج کے قبائل کی خاصی تعداد اسلام قبول کر چکی تھی۔ آپ کی آمد سے اہل مدینہ میں دین وشریعت پر عمل کرنے اور اس کے مطابق معاشرہ کو ڈھالنے کا جذبہ مزید گہرا ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہجرت کے پہلے سال کچھ ایسے اجتماعی فیصلے فرمائے جن کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ مدینہ منورہ میں امن وسلامتی کے قیام میں مدد ملی بلکہ امت مسلمہ کا قبائلیت، علاقائیت اور لسانیت سے بالاتر ایک عالمگیر تشخص نمایاں ہو گیا۔

اسلام کا پیغام تو آغاز ہی سے عالمگیر تھا اور کسی خاص علاقہ، نسل یا قبیلہ کے لوگوں تک محدود نہیں تھا۔ اس کے دامن میں قبائل قریش کو بھی پناہ ملی اور اوس خزرج کے باہم متحارب گروہوں کو بھی امن وسکون ملا، بت پرستوں کے لئے بھی اس کے دروازے اسی طرح کھلے ہوئے تھے جس طرح یہود ونصاریٰ کے لئے کھلے ہوئے تھے، چنانچہ شروع سے ہی مختلف علاقوں اور مختلف مذاہب کے لوگوں نے اسلام کی حقانیت کو سمجھا اور اسے قبول کیا۔

یہودیوں کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ وہ نسل پرستی کے اندھے تعصب میں مبتلا رہے ہیں، اسلام کے ابدی پیغام کے بارے میں بھی ان کا ردعمل معاندانہ اور تعصّبانہ تھا، انہوں نے مدنی دور کے آغاز سے ہی سازشیں شروع کر دی تھیں۔ ان کی سازشوں کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو خاص طور پر جزیرۃ العرب میں اور عام طور پر دنیا بھر میں پھیلنے سے روکا جائے۔ نیز دین کی بنیاد پر امت مسلمہ کو عالمی طور پر ابھرنے نہ دیا جائے، چنانچہ یہودیوں نے شروع سے ہی خفیہ طور پر سازشیں کیں، امت مسلمہ کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ امت کی عالمگیر وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے بہت سی سازشیں کیں۔

عبداللہ بن ابی جو منافقین کا سرکردہ لیڈر تھا یہودیوں کے ساتھ خاص راہ ورسم رکھتا تھا، اس نے مدینہ منورہ میں علاقائی

دی کہ وہ بیرونی عناصر (مہاجرین) کو مدینہ منورہ کی سر زمین سے نکال دیں اور اس کی قیادت کو تسلیم کرلیں تا کہ وہ ان کی قومی حکومت قائم کر سکے۔ عبداللہ بن ابی نے نیشنلزم کا تعصب پھیلانے کی پوری پوری کوشش کی، اہل مدینہ کو بارہاشہہ پر چار یہودیوں کی ملی بھگت سے کیا تھا۔ بنوحنیفہ کے لیڈر مسیلمہ کذاب نے بھی علاقائی بنیاد پر نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھا کہ آپ اپنی قوم (قریش) تک اپنی قیادت محدود رکھیں اور اس کے علاقے کے لوگوں کی حکومت اس کے حوالے کردیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیلمہ کذاب کے قومیت کے اس نظریہ کو رد فرمایا تھا، مورخین لکھتے ہیں کہ مسیلمہ کذاب نے علاقائی تعصب ابھار کر اپنی قیادت چمکانے کی کوشش کی تھی۔

یہودی قبائل اس حد تک اپنی سازشوں میں آگے بڑھے کہ انہوں نے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھانے کی سازش کی تھی اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قتل کرنے کا گھناؤنا منصوبہ بنایا، لیکن عہد نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مستحکم قیادت اور رسالت کی وجہ سے یہودیوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ دین اسلام کا ہر شعبہ زندگی میں غلبہ ہوا اور امت مسلمہ کا اجتماعی نظم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت مزید مستحکم ہوا، نتیجتاً اسلامی نے ایک مضبوط اور عالمگیر تہذیب وتمدن اسلامی عقیدہ واخلاق کی بنیادوں پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔

یہودی سازشوں کا سلسلہ عہد رسالت کے بعد بھی جاری رہا، لیکن عہد خلافت میں بھی انہیں کامیابی نہیں ہوسکی، عہد رسالت وخلافت میں امت مسلمہ کا اجتماعی شعور بیدار تھا۔ اخلاص، دیانتداری، اخلاقی اقدار اور جذبہ علم وعمل مضبوط تھا، امت مسلمہ کی قیادت جن ہاتھوں میں تھی وہ بھی مخلصانہ طور پر اسلامی اقدار کے محافظ تھے، ان کے ملی احساس وشعور اور ذہانت وفراست کی وجہ سے یہودیوں کو اپنے سازشی منصوبوں میں کامیابی نہیں ہوسکی، دین اسلام اپنی پوری قوت وعظمت کے ساتھ دنیا میں پھیلتا رہا۔

انیسویں صدی کے اختتام پر بیسویں صدی کے آغاز میں یہودیوں نے زیادہ منظم طریقہ سے اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف سازشوں کا جال بچھانا شروع کردیا، ان سازشوں میں تین نمایاں محاذ تھے:

☆ اسلام کے بنیادی عقائد وماخذ کو چیلنج کرنا۔ ایسے لوگ باقاعدہ تیار کئے گئے جو دین کی بنیادوں کو مشکوک بنا کر پیش کریں اور خاص طور پر سنت کی آئینی حیثیت کو تبدیل کریں اس کا مقصد یہ تھا کہ عام لوگوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کر کے انہیں دین سے دور کیا جائے۔ مستشرقین کا ایک گروہ کافی عرصہ سے اس مقصد کے لئے کام کررہا ہے۔ اور ان کی تحریروں اور کتابوں کی اشاعت کا کام بہت منظم طریقہ سے ہورہا ہے۔

☆ قوموں کی زندگی میں اجتماعی اخلاقی اقدار کی بہت اہمیت ہے، جو قومیں اجتماعی طور پر اخلاق پستی کا شکار ہوجاتی ہیں اور اپنے اقدار کو پامال کر کے بے راہ روی کا شکار ہوجاتی ہیں وہ ہمیشہ زوال پذیر ہوتی ہیں۔ امت مسلمہ میں بے راہ روی اور بدکرداری کو فروغ دینے کے لئے نہ صرف یہ کہ خفیہ طریقوں کو استعمال کیا گیا بلکہ ثقافت وکلچر کے نام پر بہت سی تنظیموں کو یہ

کام سونپا گیا ہے۔ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی بنیادیں بھی تبدیل کرنے کی کوششیں کی گئیں تا کہ سوچ وفکر کا انداز بھی بدل جائے "اپنے علاوہ تمام اجتماعی قوتوں کو ختم کرنے کے لئے اجتماعیت کی پہلی بنیاد کو تباہ کرنا یعنی جامعات کو۔"

☆امت مسلمہ کے سیاسی مقام اور بین الاقوامی امور میں ان کے کردار کو ختم کرنے کے لئے بھی بہت سی خفیہ تنظیمیں قائم کی گئیں، ان کا مقصد امت کے سیاسی اداروں کو تباہ کرنا تھا۔ گزشتہ صدی میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ خلافت کے ادارہ کو مکمل طور پر تباہ کر دیا جائے امت کے مفہوم کو بھلا کر علاقائی اور نسلی تصورات کو ابھارا جائے۔ جہاد، اجتہاد، شوریٰ اور اجماع وغیرہ کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے نکال دیا جائے جس کے بعد امت اسلامیہ میں جدواحد کا تصور ایک خواب بن کر رہ جائے، یہودی تنظیمیں اپنے گھناؤنے مقاصد کے لئے مسلسل کام کر رہی ہیں۔ یہودیوں کو اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔ اس کی وضاحت کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، امت مسلمہ کی موجودہ حالت زار اور ماضی قریب کی تاریخ سب کے سامنے عیاں ہے۔

خلافت کا ادارہ ملت اسلامیہ کی سیاسی و اجتماعی عظمت کا نگہبان رہا ہے جب تک یہ ادارہ قائم رہا اس وقت تک دنیا بھر میں ملت اسلامیہ کو ایک باعزت نمایاں مقام حاصل تھا۔ بین الاقوامی معاملات میں کوئی اہم فیصلہ ملت اسلامی کی شرکت کے بغیر ممکن نہیں تھا، کمزور سے کمزور خلیفہ کی بات بھی بڑا وزن رکھتی تھی اس لئے کہ خلیفہ کی بات دنیا بھر میں مسلمانوں کی بات سمجھی جاتی تھی، امت مسلمہ کو بھی خلافت کے ساتھ دینی، تہذیبی، تمدنی اور تاریخی تعلق رہا ہے۔

نظم خلافت کی وجہ سے امت مسلمہ کو اقوام عالم میں جو مقام اور عزت حاصل ہوئی ہے، اس کے بنیادی سبب دو تھے: ایک تو یہ کہ خلافت اقامت دین کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کا نام ہے، دوسرے یہ کہ خلافت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی اور امت واحدہ کے شعور نے خلیفہ کو دنیا بھر کے مسلمانوں میں بہت عزت اور احترام کا مقام عطا کر دیا تھا۔ خلافت بعض ادوار میں غیر متحرک ہونے کے باوجود امید کی کڑی تھی جو مسلمانوں کا وفاق اور نقطہ اتحاد بن سکے۔ یہودی مسلمانوں کی اس عظمت وقوت کو ختم کرنا چاہتے تھے اس لئے کہ خلافت ان کے لئے بے جا عزائم کی راہ میں رکاوٹ تھی۔

انیسویں صدی کے اخیر میں صہیونیت کے سیاسی پروگرام کا آغاز ہوا۔ تھیوڈور ہرزی (Theodor Herzi 1860 1904)۔ نے اس منصوبہ کی بنیاد رکھی اس نے اپنی کتاب (Der Juden Stovat یہودی ریاست) میں یہودیوں کی علیحدہ ریاست کا تصور دیا اور ساتھ ہی اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع ہوگئیں 1897ء میں پہلی عالمی صہیونی کانگریس کا انعقاد باسل (Basle) میں ہوا، اس کے ذریعہ بظاہر تو بنیادی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا تھی کہ یہودیوں کے کچھ قومی وسیاسی مسائل ہیں، اقوام عالم کو ان مسائل کو حل کرنے میں توجہ مبذول کرنا چاہیے۔ اگر معاملہ اسی حقیقت تک محدود ہوتا تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا لیکن یہودیوں کا اصل

پروگرام خفیہ تھا، یہودی نسل اور ریاست کی تعمیر میں بہت سی اقوام کی تباہی کا منصوبہ مضمر تھا، یہودیوں کے ان سازشی منصوبوں میں استعماری قوتیں بھی شریک ہوگئیں تھیں۔ یہودیوں کا سب سے بڑا ہدف مسلمانوں کا نظم خلافت تھا، یہودی اسے ہر صورت میں ختم کرنا چاہتے تھے اس لئے کہ اپنے مزاج، عناصر اور جذبہ ایمانی کی بدولت اگر کوئی قوم یہود اور شر کے مقابلہ کی قوت رکھتی ہے تو وہ فطری حریف صرف ملت اسلامیہ ہے، ان مذموم مقاصد کے حصول کے لئے صہیونی طاقتوں نے دو محاذوں پر کام شروع کیا، ایک طرف ترکی کے اندرونی محاذ پر زیر زمین کام شروع کیا اور داخلی مسائل پیدا کرکے حکومت کو کمزور کرنے کی کوششیں کیں، دوسری طرف عربوں میں نیشنل ازم اور علاقائیت کے جراثیم پیدا کرکے انہیں خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔

صہیونی طاقتوں نے مشرق وسطیٰ میں اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے برطانوی نژاد ایک فرد تھامس ایڈورڈ لارنس کو خاص طور پر یہ ذمہ داری سپرد کی کہ وہ فلسطین، شام اور جزیرہ عرب میں شیوخ اور امراء کو بغاوت پر آمادہ کرے۔ لارنس آثار قدیمہ کا ماہر تھا۔ آثار قدیمہ کے مطالعہ کے بہانے اس نے بارہا عرب ممالک کا دورہ کیا۔ کالج کے زمانہ میں اسے قرون وسطیٰ میں فوجی فن تعمیر سے خاص دلچسپی رہی، اس نے فرانس میں صلیبی دور کے قلعوں کا مطالعہ کیا، شام اور فلسطین کی جنگی اہمیت کی عمارتوں پر تحقیق کی اور اس موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ جیس کالج آکسفورڈ میں پیش کرکے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ 1942ء کے آغاز میں لارنس نے اپنے ساتھیوں وولی اور کیپٹن نیوکومب کے ساتھ صحرائے سینا کی سیاحت کی اور اس سارے علاقے کا بغور مطالعہ کیا، خاص طور پر نہر سویز کے مشرق میں ترکی کی سرحد سے متصل علاقوں کا سروے کیا غزوہ اور عقبہ جیسے علاقے جو حربی نقطہ نگاہ سے بہت اہم تھے، کا جائزہ لیا اور ان علاقوں کے نقشے تیار کئے۔

پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو لارنس لندن کے جنگی ہیڈکوارٹر میں ماہر نقشہ نویس کی حیثیت سے بھرتی ہوگیا، جہاں اس نے صحرائے سینا کے نقشے تیار کرکے فوج کے حوالے کئے، لارنس نے نہ صرف یہ کہ نقشوں کی تیاری میں حکومت برطانیہ کی مدد کی، روشنی میں ایسے مشورے بھی دیئے جس پر عمل کرکے خلاف عثمانیہ کو نقصان پہنچایا جاسکتا تھا، لارنس کی ان خدمات کے پیش نظر حکومت نے اسے فوج کی خفیہ سروس کے محکمہ میں لیفٹیننٹ کی حیثیت سے بھرتی کرکے قاہرہ بھیج دیا جہاں اس نے ترک افواج کے بارے میں راز حاصل کئے اور ترکی کے زیر انتظام عرب علاقوں کے نقشے بنائے، عربوں میں رہ کر لارنس نے عربی زبان پر مہارت حاصل کرلی اور وہ عرب تہذیب اور ثقافت سے بھی خوب واقف ہوگیا تھا، خفیہ ایجنسیوں نے جلد ہی اسے گرین سگنل دے دیا کہ وہ عربوں میں عرب قومیت اور علاقائیت کے نظریہ کو ابھارے اور اس کی بنیاد پر عربوں کو ترکی کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرے۔

لارنس نے تو پہلے سے ہی عربوں سے اچھے تعلقات بنا رکھے تھے اس نے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کرکے عربوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرلیا، اس بغاوت میں سب سے نمایاں کردار امیر مکہ حسین بن علی کا تھا جسے یہ لالچ دیا گیا

کہ وہ سارے عرب کا حکمران بنا دیا جائے گا، اس سازش میں امیر مکہ کے بیٹے عبداللہ اور فیصل بھی شریک ہو گئے۔ فیصل ان دنوں عرب فوج کے ایک دستہ کا کمانڈر تھا، کچھ اور بااثر شیوخ بھی امیر مکہ کے ساتھ شریک ہو گئے، ان کی مدد سے لارنس نے ترکوں کے خلاف گوریلا جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا اور دمشق سے مدینہ منورہ تک پلوں، شاہراہوں اور ریلوے لائن کو نقصان پہنچایا جس سے ترکوں کی سپلائی بری طرح متاثر ہوئی، ایسی افواہیں بھی پھیلائی گئیں جو عربوں اور ترکوں میں باہم نفرت پیدا کر سکتی تھیں۔ ادھر یہودی جنگ عظیم اول کے دوران اپنے خفیہ منصوبوں پر عمل درآمد میں مصروف تھے اور اس جنگ سے ایسے نتائج حاصل کرنا چاہتے تھے جو ان کے صہیونی عزائم کو پورا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ لارنس کو دونوں کا تعاون حاصل تھا، برطانوی استعمار کا بھی اور صہیونی قوتوں کا بھی لارنس کو جلد ہی فیصل کی فوج میں لیفٹیننٹ کرنل کا عہدہ دے دیا گیا، حکومت برطانیہ کی جانب سے باغی قوتوں کو مالی امداد بھی دی گئی اور اسلحہ بھی سپلائی کیا گیا، ادھر امیر مکہ کو یہ لالچ دیا گیا کہ یہ سب کچھ اس کی آزاد مملکت کے قیام کے لئے کیا جا رہا ہے اور یہ کہ بہت جلد اس کی تاج پوشی کی تقریب کی جائے گی۔

یہودیوں کی سازشیں رنگ لائیں اور بالآخر 1918ء میں ترکوں کا شام پر اقتدار ختم ہو گیا، لارنس اور اس کے گوریلوں نے ترکوں کو اس محاذ پر سخت نقصان پہنچایا، لارنس نے اس جنگ میں بہت ہی سفاکی کا مظاہرہ کیا، اس نے عرب فوج کو حکم دیا کہ وہ ترکیوں کو جنگی قیدی نہ بنائیں بلکہ انہیں موقع پر ہی گولی مار دیں، اس طرح ترکوں کا بہت بڑا جانی نقصان ہوا۔ ترکوں کا اقتدار ختم ہوتے ہی لارنس اور استعماری قوتیں اپنے وعدوں سے پھر گئیں، امیر مکہ سے جو وعدے کئے وہ پورے نہیں ہوئے بلکہ ایک خفیہ معاہدہ کے تحت عراق و فلسطین پر برطانیہ قابض ہو گیا اور شام کے علاقہ پر فرانس نے تسلط جما لیا۔

خلافت عثمانیہ کے خلاف اندرونی محاذ پر یہودیوں نے جو سازشی جال پھیلایا اس کی ایک جھلک دکھانے کے لئے ہم خلیفہ عبدالحمید ثانی کا ایک تاریخی خط پیش کر رہے ہیں جو انہوں نے اپنے شیخ حضرت ابوالشامات محمود آفندی علیہ الرحمہ کو اس وقت لکھا تھا جب عبدالحمید کو خلافت سے معزول کر کے جلاوطنی اور قید تنہائی پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

قارئین کرام! اس خط کے مندرجات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ امت مسلمہ کے نظم خلافت کو منہدم کرنے کے لئے صہیونی طاقتوں نے کیسی کیسی سازشیں کیں اور یہ کہ ان سازشوں میں کون کون شریک رہے، خط کا اردو ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

یاھو! بسم اللہ الرحمن الرحیم. الحمدللہ رب العالمین وأفضل الصلاۃ وأتم التسلیم علی سیدنا محمد رسول رب العالمین صلی للہ علیہ وسلم وعلی آلہ واصحابہ أجمعین الی یوم الدین.

میں انتہائی نیازمندی کے ساتھ طریقہ شاذلیہ کے اس عظیم المرتبت شیخ ابوالشامات آفندی کی خدمت اقدس میں جن کے روحانی فیوض و برکات سے اپنے دور کے بڑے بڑے مشایخ کو روحانی جلا اور بالیدگی

حاصل ہوئی یہ عرض داشت پیش کرتا ہوں۔

اولاً میں اپنے محترم شیخ کے بابرکت ہاتھوں کو بوسہ دینے کی سعادت حاصل کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ حضرت والا مجھے اپنی نیک دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

تقدیم احترام کے بعد عرض گزار ہوں کہ مجھے آپ کا اس سال (۱۹۱۳) ۲۲ مئی کا لکھا ہوا گرامی نامہ موصول ہوا میں تہہ دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا ہوں اور اس کی بارگاہ میں حمد وثناء کرتا ہوں کہ اس نے آنجناب کو ہر طرح خیر وعافیت سے رکھا۔ سیدی! اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بڑا فضل وکرم ہے اور انہی کی توفیق سے میں طریقہ شاذلیہ کے وظائف پابندی کے ساتھ دن رات پڑھ رہا ہوں جناب والا یہ میری عاجزانہ درخواست ہے کہ میرے لئے دل کی گہرائیوں سے دعا فرماتے رہیں، میں ہمیشہ سے آپ کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔ اس مختصر سی درخواست کے بعد میں جناب محترم اور آپ جیسے مخلص علمائے کرام دینی قیادت رکھنے والوں، امت مسلمہ کے تمام سنجیدہ اور عقل سلیم رکھنے والوں اور آئندہ آنے والی نسلوں کی خدمت میں درج ذیل تاریخی امانت پیش کرتا ہوں:

جناب والا! میں یہ بات صاف صاف بتانا چاہتا ہوں کہ امت مسلمہ کی خلافت کی ذمہ داریوں سے از خود دست بردار نہیں ہوا بلکہ مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا گیا ہے، یونینسٹ پارٹی جو جوانان ترک کے نام سے مشہور ہے، نے میرے راستہ میں بے شمار رکاوٹیں پیدا کردی تھیں، مجھ پر بہت زیادہ اور ہر طرح کا دباؤ ڈالا، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مجھے دھمکیاں دیں اور سازشوں کے ذریعے مجھے خلافت چھوڑنے پر مجبور کیا، یونینسٹ پارٹی نے پہلے تو مجھ پر اس بات کے لئے دباؤ ڈالا کہ میں مقدس سرزمین فلسطین میں یہودیوں کی قومی حکومت کے قیام سے اتفاق کرلوں۔ مجھے اس پر مجبور کرنے کی کوششیں بھی کیں لیکن ان کے تمام دباؤ کے باوجود میں نے اس مطالبہ کو ماننے سے انکار کردیا۔ میرے اس انکار کے بعد ان لوگوں نے مجھے ایک سو پچاس ملین اسٹرلنگ پاؤنڈ سونا دینے کی پیش کش کی میں نے اس پیش کش کو بھی یہ کہہ کر رد کردیا کہ یہ ایک سو پچاس ملین اسٹرلنگ پاؤنڈ سونا تو ایک طرف اگر تم یہ کرہ ارض سونے سے بھر کر پیش کرو تو میں اس گھناؤنی تجویز کو نہیں مان سکتا۔ میں تیس سال سے زیادہ عرصہ تک امت محمدیہ کی خدمت کرتا رہا ہوں اس تمام عرصہ میں میں نے کبھی بھی اس امت کی تاریخ کو داغدار نہیں کیا، اسی طرح میرے آباء واجداد اور خلافت عثمانیہ کے حکمرانوں نے بھی ملت اسلامیہ کی خدمت کی ہے اس کی تاریخ کو تابناک رکھا ہے لہٰذا میں کسی صورت اور کسی حالت میں بھی اس تجویز کو نہیں مان سکتا۔

میرے اس طرح واضح انکار کے بعد مجھے خلافت سے ہٹانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس فیصلے سے مجھے مطلع

کردیا گیا کہ مجھے سلانیک میں جلاوطن کیا جارہا ہے مجھے اس فیصلہ کو ہی قبول کرنا پڑا۔ کیونکہ میں خلافت عثمانیہ اور ملت اسلامیہ کے چہرے کو داغدار نہیں کرسکتا تھا۔ خلافت کے دور میں فلسطین میں یہودیوں کی قومی حکومت کا قیام ملت اسلامیہ کے لئے انتہائی شرم ناک حرکت ہوتی اور دائمی رسوائی کا سبب بنتا۔ خلافت ختم ہونے کے بعد جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ میں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود ہوں اور ہمیشہ اس کا شکر بجالاتا ہوں (کہ اس رسوائی کا داغ میرے ہاتھوں نہیں لگا) میرے خیال میں جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ واقعات کو سمجھانے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ بس اس غرض کے ساتھ میں اپنی تحریر ختم کرتا ہوں۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر آپ کے متبرک ہاتھوں کو چومنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں اور پوری پوری امید کرتا ہوں کہ جناب میرے آداب وتسلیم کو قبول فرمائیں گے۔ تمام احباب اور دوستوں کو بھی میرا اسلام پیش کردیجئے۔ میرے مرشد! میں نے پوری دیانت داری کے ساتھ اس معاملہ کو آپ کے سامنے پیش کردیا ہے۔ یہ میری دلی خواہش تھی کہ میں آپ اور آپ جیسے مخلص احباب کی توجہ اس معاملہ کی طرف مبذول کراؤں۔ انتہائی ادب واحترام کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بے شمار رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔ والسلام ۲۲ ایلول 1329 (عثمانی کیلنڈر کے مطابق ستمبر ۱۹۱۳ء)

(ملت اسلامیہ کا خادم عبدالحمید بن عبدالمجید)

خلیفہ عبدالحمید کے اس خط کا بغور مطالعہ کریں تو بہت سے حقائق سامنے آتے ہیں سب سے پہلی بات تو یہ کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر غیر متزلزل یقین تھا یہ یقین ان کے ایمان کامل کی دلیل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایمان کا یہ درجہ جس کی جھلک ان کے مکتوب میں نظر آرہی ہے انہیں قید تنہائی میں حاصل ہوا ہو۔ لیکن اس پورے خط کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایمان ویقین کا مضبوط درجہ قید وبند کی صعوبتوں سے پہلے بھی انہیں حاصل تھا۔ یہ ایمان کی قوت ہی تو تھی جس کی وجہ سے انہوں نے یہودیوں کی اتنی بڑی مادی پیش کش ٹھکرادی اور ملت اسلامیہ کی تاریخ کو اپنے عہد میں داغدار ہونے سے بچائے رکھا اور دوسرے یہ کہ اہل اللہ اور اہل علم سے انہیں گہرا قلبی تعلق تھا۔ خلیفہ ان کا جس قدر احترام کیا کرتے تھے اس کا اظہار ان کے اس خط کے ایک ایک لفظ سے ہوتا ہے۔ تزکیہ قلب وروح کے لئے وہ باقاعدہ سلسلہ پر عزم استقامت کے ساتھ ڈٹے رہے اور اپنے دور خلافت میں یہودیوں کو سرزمین فلسطین میں قطعہ زمین کسی قیمت پر بھی خریدنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب تک ترکی میں خلافت عثمانیہ قائم رہی اس وقت تک استعماری قوتوں کا فلسطین میں یہودی مملکت کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

یہ ایسے حقائق ہیں جن پر امت مسلمہ کو غور وفکر کرنا چاہئے کہ کس قدر عیاری کے ساتھ اغیار نے ہمارا اجتماعی نظم تباہ کیا اس کے ساتھ ہی ہمارا تعلیمی، تربیتی، معاشرتی نظام منتشر ہوکر رہ گیا۔

فاعتبروا یاأولي الأبصار

عہ غور وفکر کا موقع اب کہاں رہ گیا ہے۔ نوحہ وماتم کرنا چاہیئے - ابوکاں

میڈیا......اسلام کے خلاف مغرب کا مؤثر ہتھیار

پروفیسر عبدالعظیم جانباز

موجودہ دور میڈیا کا دور ہے۔غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ مغرب محض مؤثر اور طاقتور میڈیا کے ذریعے ہی ہمارے ذہنوں پر حکومت کر رہا ہے۔ یہاں ہم سے مراد صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پاکستان جیسے وہ ممالک بھی اس میں شامل ہیں جہاں سیاسی شعور کا فقدان ہے۔ جہالت عروج پر ہے اور مغربی تعلیم یافتہ طبقہ ہر قسم کی رہنمائی کے لئے مغرب کی جانب دیکھتا ہے۔یہ ہمارے پڑھے لکھے طبقے کا احساسِ کمتری ہے کہ وہ مغرب کے ایجاد کردہ ہر لفظ، اصطلاح اور محاورے کو یوں قبول کر لیتا ہے جیسے یہ الہامی بات اور مقدس لفظ ہو۔چنانچہ اس طرح مغرب میڈیا نت نئے شوشے چھوڑتا رہتا ہے جن کا مقصد ہماری سوچ کو متاثر کرنا اور ہماری فکر کو ایک خاص رُخ پر ڈالنا ہوتا ہے۔یاد رکھئے کہ یہ دور جسمانی غلامی کا نہیں بلکہ ذہنی غلامی کا ہے۔ماضی میں جب ضعیف قوموں کو غلام اور کمزور ملکوں کو تجارتی مقاصد کے لئے کالونی بنایا جاتا تھا تو مغربی ممالک نے پسماندہ اقوام کی ایک بڑی تعداد کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔اس دور میں انسانی حقوق کا کہیں ذکر نہیں تھا، کیونکہ انسانی حقوق کا فلسفہ نہ صرف مغربی استعمار کے مفادات کے منافی تھا بلکہ مغربی استعمار کی نفی بھی کرتا تھا، اس طرح مغربی ممالک کئی صدیوں تک پسماندہ ممالک کو اپنی کالونیاں بنا کر ان کے مالی وشخصی وسائل کو اپنی صنعتی وتجارتی ترقی کے لئے استعمال کرتے رہے۔اگر آپ لندن، پیرس اور روم جیسے خوبصورت شہروں کی بڑی بڑی شاہراہوں، عمارتوں اور صنعتی مراکز کی بنیاد میں جھانکیں تو ان میں سے آپ کو اپنے بزرگوں کے محنت، خون پسینے کی خوشبو آئے گی اور وہاں ہماری سرزمینوں کا مال ہتھیا کر صرف کیا گیا ہوگا۔

جب ان استعماری قوتوں کو آزادی کی تحریکوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر غلام ممالک سے رخصت ہونا پڑا تو اس کے ساتھ ہی انہیں جمہوری اقدار اور انسانی حقوق کا خیال آیا۔چنانچہ انسانی حقوق کے دفاع کے لئے عالمی سطح پر انجمنیں بنائی گئیں۔کل تک انسانوں کو حیوانوں سے کم تر سمجھنے والے چند ہی برسوں میں انسانی حقوق کے ٹھیکے دار بن گئے۔گویا پرانا شکاری نیا جال

لے کر آیا۔ یہ درست ہے کہ اس وقت بعض ممالک میں یہ انجمنیں مفید کام بھی کر رہی ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جن ممالک میں اولادِ آدم کو مغربی اقوام کی ملی بھگت سے کچلا جا رہا ہے وہاں بھی انسانی حقوق کی انجمنیں موجود ہیں جو بے کار اور غیر مؤثر ہیں۔ گزشتہ چند برسوں سے اولادِ آدم کے انسانی حقوق کی حفاظت کی اجارہ داری امریکہ بہادر کے پاس ہے۔ ادھر مغربی میڈیا نے انسانی حقوق کو ایک آئیڈیالوجی بلکہ مذہب کا درجہ دے دیا ہے، اس سے امریکہ کو یہ استحقاق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ کسی بھی ایسے ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دے سکتا ہے بلکہ اسے دہشت گرد قرار دے کر سزا کا حق دار ٹھہرا سکتا ہے، جہاں انسانی حقوق پر زد پڑتی ہو۔ کس ملک میں انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں؟ اس کا فیصلہ بھی امریکہ ہی کرے گا۔ چنانچہ امریکہ عراق پر بمباری کر کے سینکڑوں معصوم شہریوں کو موت کی نیند سلا دے تو وہ انسانی حقوق کے حوالے سے درست اقدام قرار دیا جاتا ہے، لیکن بوسنیا میں ہزاروں معصوم مسلمان سربیائی ظلم کی بھینٹ چڑھ جائیں تو امریکہ کے ضمیر میں خلش تک نہیں ہوتی، کیونکہ بوسنیا مسلمان ملک ہے۔ اس طرح پاکستان اگر کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی اخلاقی امداد کرے تو وہ سزا کا مستحق ہے، لیکن بھارت اگر ہزاروں مسلمانوں کو گولی کا نشانہ بنا دے تو اس سے چشم پوشی برتی جائے گی۔

انسانی حقوق کے حوالے سے مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا، ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ کسی بین الاقوامی سیمینار کے ضمن میں مجھے امریکی ساحلی شہر سان فرانسسکو جانے کا موقع ملا۔ اس سیمینار میں ایشیائی ممالک کے اسکالرز کے علاوہ مختلف امریکی یونیورسٹیوں سے بھی ممتاز پروفیسرز صاحبان بلائے گئے تھے۔ سیمینار کے آغاز سے ایک روز قبل میں نے ٹیلی ویژن آن کیا تو ایک دلچسپ خبر مع تبصرہ سننے کو ملی۔ کیلیفورنیا کی ریاست میں جنگلات کے وسیع ذخیرے پائے جاتے ہیں، کیونکہ وہاں عمارات کی تعمیر میں لکڑی بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے، اس لئے سال بھر ان جنگلوں کی کٹائی کا عمل جاری رہتا ہے۔ خبر یہ تھی کہ کٹائی کے دوران ماہرین جنگلات کو اچانک یہ پتہ چلا کہ اس جنگل میں ایک اُلّو صاحب نے مستقل اپنا گھر بنا رکھا ہے اور جب سے درختوں کی کٹائی کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اُلّو صاحب اداس رہنے لگے ہیں۔ اُلّو کی اداسی کی خبر سے اس علاقے میں احتجاج ہوا اور کیلیفورنیا کی حکومت نے جنگل کی کٹائی روک دی جس سے لکڑی کی قیمت میں اضافہ ہو گیا اور گھروں کی تعمیر قدرے مہنگی ہو گئی۔ میں نے یہ خبر اور اس پر تبصرہ ٹیلی ویژن پر سنا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اگلے دن سیمینار کے دوران چائے کا وقفہ ہوا تو میں نے ممتاز امریکی پروفیسر صاحبان سے اس خبر کا تذکرہ کیا۔ وہ پہلے ہی اس سے آگاہ تھے، لیکن میرے ذکر کرنے پر ان کے چہرے مسرت سے گلاب کی مانند کھل گئے۔ اس صورت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے یہ سوال داغ دیا کہ ”آپ نے ایک پرندے کی اُداسی کی خاطر جنگل کی کٹائی روک کر لکڑی کی قیمت میں اضافہ برداشت کر لیا، لیکن کچھ عرصہ قبل جب عراق کے معصوم شہریوں پر بموں کی بارش کی جا رہی تھی تو آپ کیوں خاموش رہے؟ کیا آپ کو ایک جانور کسی مسلمان کی زندگی سے زیادہ عزیز ہے؟ میرے اس سوال سے ان کے

چہرے کے رنگ اُڑ گئے۔اس واقعے سے آپ امریکہ کی انسانی حقوق سے کمٹمنٹ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ آج کا دور میڈیا کا دور ہے۔میڈیا بد قسمتی سے یہودیوں کے قبضے میں ہے اور یہودیوں کا نشانہ بہر حال اسلام اور مسلمان ہیں۔اب جب کہ مغربی ممالک غیر ترقی یافتہ ممالک سے بوریا بستر لپیٹ کر رخصت ہو چکے ہیں تو انہوں نے ان ممالک پر حکمرانی کا ایک نیا طریقہ وضع کیا ہے اور وہ طریقہ ہے: میڈیا کے زور پر ذہنوں پر حکومت کرنا۔ نصف صدی قبل جسمانی غلامی بھی ہمارا مقدر تھی اور اب ذہنی غلامی ہماری قسمت کا حصہ ہے۔سوچئے تو سہی کہ اس کی وجوہات کیا ہیں؟اسی پس منظر میں مغربی میڈیا جب چاہتا ہے کوئی نئی اصطلاح اور کوئی نیا شوشہ چھوڑ دیتا ہے۔دنیا کے بہترین رسائل جن میں ادبی،تحقیقی اور سیاسی پرچے شامل ہیں،مغربی ممالک سے شائع ہو کر ساری دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ان رسائل میں اکثر اوقات ایک خاص نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے جو مغربی دنیا کے مفادات کے عین مطابق ہوتا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ عالمی شہرت کے رسالے ٹائم، اکانومسٹ اور نیوز ویک پر یہودی لابی غالب ہے۔یہ رسالے ہر ہفتے بین الاقوامی سیاست پر تبصرے کرتے اور تجزیئے شائع کرتے ہیں جنہیں ہم من وعن مقدس تحریر سمجھ کر یوں قبول کر لیتے ہیں کہ ان کے سیاق وسباق پر غور ہی نہیں کرتے۔پھر ہر محفل میں ان تبصروں کو''ٹائم''اور''نیوز ویک'' کے حوالے سے حرفِ آخر سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ہم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ عراق ہو،ایران ہو،بوسنیا ہو یا کشمیر۔یہ رسائل اپنے تجزیوں میں ڈنڈی ضرور ماریں گے اور کسی نہ کسی طرح اسلام اور مسلمان سے اس طرح چٹکی ضرور لیں گے کہ قاری کو محسوس بھی نہ ہو اور الفاظ اپنا کام کر جائیں۔عراق،کویت جنگ اور انقلابِ ایران کے دوران ان رسائل نے اپنا بھر پور کردار ادا کیا اور عالمی رائے عامہ کو اپنی ضروریات کے سانچے میں ڈھالا۔صرف میڈیا ہی کا کمال ہے کہ کوئی بھی اسلامی ملک اپنے موقف میں کتنا ہی حق بجانب کیوں نہ ہو،عالمی سطح پر معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور وہ سربراہانِ حکومت جو مغربی مفادات کے خلاف کام کرتے ہیں،انہیں تمسخر کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔ غور کیجیے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک طرح سے ہماری غلامانہ ذہنیت کی علامت ہے۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ جب کسی نا قابل قبول حکمران کو بدلنا مقصود ہوتا ہے تو میڈیا سے ہراول دستے کا کام لیا جاتا ہے،وہ اس طرح کہ مغربی میڈیا بڑی طاقتوں کی خفیہ ایجنسیوں کی ملی بھگت سے ایسے حکمرانوں کی ذاتی زندگی اور قومی کردار کے بارے میں من گھڑت کہانیاں شائع کرتا ہے اور آزادیٔ اظہار کے نام پر ان شخصیات کی اس طرح کردار کشی کی جاتی ہے کہ نہ صرف عالمی سطح پر ان کا امیج خراب ہوتا ہے بلکہ خود ان ممالک کے عوام بھی اپنے حکمرانوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔آپ نے اکثر مشاہدہ کیا ہوگا کہ بڑی طاقتوں کے ذریعے،ناپسندیدہ حکمرانوں کے بارے میں عجیب وغریب خفیہ داستانیں پھیلائی جاتی ہیں جبکہ اپنے حواری اور پسندیدہ حکمرانوں کی ایسی حرکات چھپائی جاتی ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں میڈیا کا کردار فیصلہ کن حیثیت اختیار کر گیا ہے اور جو مقاصد ماضی میں فوجی یلغار سے حاصل کئے

جاتے تھے، وہ مقاصد اب میڈیا کی یلغار سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

مغربی میڈیا کی مہربانی سے ایک مردہ اصطلاح میں جان ڈال دی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک متروک اصطلاح پوری دنیا میں مقبول ہوگئی۔ وہ اصطلاح ہے "Fundamentalism" یعنی بنیاد پرستی۔ امریکہ اور انگلینڈ میں شائع شدہ انگریزی لغات (Dictionaries) کے مطابق "Fundamentalism" کا مطلب ہے ''عیسائیت کے پرانے اعتقادات پر یقین رکھنا''، ''موجودہ عیسائیت جو سائنس سے متاثر ہے، اس کے مقابلے میں تو بنیاد پرستی کی مذمت سمجھ میں آتی ہے کیونکہ عیسائیت میں وقت کے ساتھ ساتھ خاصی تبدیلی آئی ہے بلکہ خود بائبل بھی اصلی حالت میں موجود نہیں رہی، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس زبان (Language) میں بائبل نازل ہوئی تھی، وہ زبان بھی آج ختم ہو چکی ہے۔ اس کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ تمام الہامی کتابوں کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود نہیں لی، سوائے قرآن مجید کے!

لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بدلا ہے نہ قرآن اور نہ ہی قیامت تک بدلے گا۔ اسلام کے بنیادی عقائد وہی ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے تھے۔ اگرچہ اسلام میں مذہبی فرقوں کی کمی نہیں، لیکن اختلافات تفصیلات پر ہیں نہ کہ بنیادی عقائد پر۔ چنانچہ اسلام میں دراصل بنیاد پرستی کا تصور اس طرح موجود نہیں جس طرح عیسائیت میں ہے لیکن مغربی میڈیا نے اسلام میں بنیاد پرستی کی اصطلاح ایجاد کر کے ان مسلمانوں کو نفرت اور تضحیک کا نشانہ بنایا ہے جو عملاً مسلمان ہیں۔ میرے نزدیک اسلام میں بنیاد پرستی کا مطلب اسلام کے بنیادی عقائد پر عمل کرنا ہے یعنی ہر وہ مسلمان جو نماز پڑھتا، روزے رکھتا اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے، اسے مغربی میڈیا بنیاد پرست کہے گا۔ ہمارے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر مسلمان نماز پڑھتا ہے تو وہ بنیاد پرست ہے، لیکن اگر وہ تہجد پڑھتا ہے تو پھر وہ بہر صورت دہشت گرد ہے۔''

کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ یہ اصطلاح چند برس قبل افغانستان کی جنگ کے حوالے سے استعمال ہونی شروع ہوئی اور چند ہی برسوں میں اس نے دنیائے اسلام کو معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا؟ مغربی میڈیا نے نہایت ہوشیاری سے بنیاد پرستی کا مطلب جاہل، ترقی دشمن، دہشت گرد، دقیانوسی اور کٹر نظریات کے حامل کے طور پر پیش کیا بلکہ اس قدر اس کا شور مچایا کہ ہر مسلمان ہاتھ باندھ کر کہنے لگا کہ حضور میں بنیاد پرست نہیں ہوں حالانکہ بنیاد پرستی کا مطلب فقط اسلام کے بنیادی عقائد پر عمل کرنا ہے اور اس کا مطلب ہرگز دہشت گردی یا دقیانوسی نہیں۔ چنانچہ اب جب بھی کوئی مغربی صحافی اسلامی ممالک میں جاتا ہے اور سربراہانِ حکومت یا دوسری اہم ملکی شخصیات سے یہ سوال پوچھتا ہے کہ کیا آپ بنیاد پرست ہیں تو جواب ملتا ہے کہ ہم بالکل بنیاد پرست نہیں، ہم اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اسلام کے بنیادی ارکین پر یقین رکھتے ہیں نہ عمل کرتے ہیں۔ خود مغربی میڈیا بنیاد پرستی کا لیبل لگانے میں کس قدر انصاف سے کام

لیتا ہے، اس کا اندزہ صرف اس ایک مثال سے لگائیے کہ جب تک گلبدین حکمت یار افغانستان میں روسی قبضے کے خلاف لڑ رہے تھے، جس سے امریکی مفادات حاصل نہ ہوتے تھے تو وہ جنگ آزادی کے ہیرو تھے، لیکن جب روس کی شکست کے بعد اس نے امریکی مفادات سے ہم آہنگ ہوکر چلنے سے انکار کیا تو مغربی میڈیا نے اسے ''بنیاد پرست'' کہہ کر مسترد کردیا۔ گویا مغربی ممالک اپنے میڈیا کو ایک طرح سے ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جو ایٹم بم سے کم خطرناک نہیں ہے۔

مغربی میڈیا نے اسلامی بنیاد پرستی کے تصور کو جس طرح مسخ کیا ہے اور اس کا مفہوم بدل کر دنیائے اسلام کو معذرت خواہانہ انداز اپنانے پر مجبور کردیا ہے۔ موجودہ حالات سے ظاہر وباہر ہے۔ میڈیا کس طرح اسلامی بنیاد پرستی کا حلیہ بگاڑ رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اخبارات کے مطابق کہا جارہا ہے کہ خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی وجہ اسلامی بنیاد پرستی کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔ اسلامی سزاؤں کو ''ظالمانہ سزائیں'' کہا جارہا ہے، پردے کے احکامات کا میڈیا پر سرعام مذاق اڑایا جارہا ہے، جہاد کو دہشت گردی کا نام دیا جارہا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ مغربی میڈیا جو کررہا ہے، سو کررہا ہے، ہمارا اپنا میڈیا بھی کسی سے کم نہیں جو آج تک جہاد اور دہشت گردی میں فرق نہیں سمجھ سکا۔ دہشت گردی ہمسایہ ملک میں ہوتی ہے، پابندی یہاں مذہبی جماعتوں پر لگتی ہے اور وہ بھی بغیر ثبوت کے۔ ہمارا اپنا میڈیا جہاد، دہشت گردی، پردے کے احکامات، اسلامی سزاؤں کے قوانین اور خواتین کے حقوق کے بارے میں جو پراپیگنڈہ کررہا ہے، وہ بھی کوئی قابل ستائش نہیں بلکہ قابل صد افسوس ہے۔ اسی طرح وہ اسلامی ممالک جہاں اسلامی شرعی سزائیں نافذ ہیں اور انہیں بنیاد پرستی کا طعنہ دیا جاتا ہے جبکہ ان معاشروں میں عورت جس قدر محفوظ ہے اس کا تصور مغرب کے آزاد معاشرے میں کیا بھی نہیں جاسکتا۔ سعودی عرب میں زیادتی کے واقعات بہت کم ہوتے ہیں جبکہ نیویارک میں ہر پانچ منٹ کے بعد عورت سے زیادتی کی واردات کی رپورٹ ہوتی ہے۔ عورتوں پر گھریلو تشدد میں امریکہ ویورپ مسلم دنیا سے بیسیوں درجے آگے ہیں، کیا امریکہ بھی بنیاد پرست ہے کہ وہاں عورتوں سے زیادتی وتشدد کے واقعات میں اضافہ ہورہا ہے؟ اگر ایسا نہیں تو مغربی ممالک میں تمام تر مادر پدر آزادی کے باوجود عورتوں سے زیادتی کے واقعات اتنی بڑی تعداد میں کیوں ہوتے ہیں؟

بہرکیف موجودہ دور میڈیا کا دور ہے، میڈیا کی لگام مغرب کے ہاتھ میں ہے اور وہ میڈیا کے زور پر ہمارے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ بنیاد پرستی کا پراپیگنڈہ اسی مہم کا حصہ ہے حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ مغرب اسلام کے احیا اور اسلامی ممالک میں عوامی سطح پر اُبھرتی ہوئی مذہبی لہر سے خوف زدہ ہے جس کا مقابلہ کرنے کے لئے میڈیا نے بنیاد پرستی کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ مغرب سے اس قدر متاثر ہے کہ وہ مغربی نظریات، تصورات اور اصطلاحات آنکھیں بند کرکے قبول کرلیتا ہے۔ گویا ہم نے مغرب سے جسمانی غلامی سے تو نجات حاصل کرلی ہے، لیکن ذہنی غلامی سے نہیں...... ذہنی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے بھی اسی طرح کی تحریکیں چلانے کی ضرورت ہے جس طرح ہم نے آزادی کے حصول کے لئے تحریکیں چلائی تھیں۔

☆

عیسائی مظالم کی ایک جھلک

پروفیسر محمد حسان خان

اسلامی اندلس کی تاریخ گرچہ قصۂ پارینہ ہے لیکن یہ قصہ اتنا دل کش، حیرت انگیز اور عبرت انگیز ہے کہ کسی نہ کسی پہلو سے یہ بار بار دہرایا جاتا ہے اور یہ کہنا قطعی مبالغہ نہیں کہ اندلس کے مسلمانوں کی شاندار حکومت اور آخر میں ان کو زبردست مظلومی نے اس موضوع کو سارے عالم میں عام کر دیا، اس وقت یورپ ولایت ہائے متحدہ امریکہ اور جنوبی امریکہ میں اس ظلم وجبر کی تفصیلات پر بہت زیادہ کام ہو رہا ہے اور اس کے نتیجے میں بہت سے رازہائے سربستہ بھی کھلتے جاتے ہیں مثلاً یہی کہ کس طرح اسپین کے مسلمانوں نے صدیوں تک چھپ کر اپنے اسلام کی حفاظت کی، بظاہر وہ عیسائی بنا لئے گئے تھے لیکن وہ اندر سے پکے سچے مسلمان تھے، اللہ تعالیٰ کے علم میں ہی ہے کہ ان لوگوں نے کتنی قربانیاں دی ہیں۔

یعنی یہ تعذیب کے سلسلے کو اب تک جاری رکھنے کی گواہی دے رہے تھے، ہمارے سامنے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد تھی، ۱۴ سال سے لے کر ۷۰ سال تک کی عمر کے مرد اور عورت قیدی تھے، بعض قیدی زندہ تھے جن کو ہم نے زنجیریں کاٹ کر زندہ بچایا، وہ زندگی کی آخری سانس لے رہے تھے، ان میں سے بعض ایذاؤں کی زیادتی سے ذہنی توازن کھو چکے تھے، یہ تمام قیدی مادر زاد برہنہ تھے، جن کو ہمارے فوجیوں نے اپنی چادروں سے ڈھانکا، یہ نظارہ عجیب تھا جو یہ بتا رہا تھا کہ اسپین میں اسلام کے خاتمہ کے بعد بھی اس کے نام لیوا اب تک موجود تھے جن کو عیسائی ظالموں نے اپنے جاسوسوں کے ذریعہ ڈھونڈ نکالا تھا اور اس تعذیب خانے میں دھکیل دیا تھا، ہم ان بدقسمت قیدیوں کو آہستہ آہستہ روشنی میں لائے کہ وہ برسوں کے اندھیرے کے بعد اچانک روشنی کی وجہ سے اپنی بینائی نہ کھو دیں، یہ قیدی خوشی سے رو رہے تھے اور فوجیوں کے ہاتھ پیر چوم رہے تھے کہ انہیں اس ہولناک عذاب سے نجات ملی اور گویا ان کو دوبارہ زندگی ملی، یہ ایسا منظر تھا کہ پتھر سے پتھر دل بھی رو دے، پھر ہم دوسرے کمروں کی طرف منتقل ہوئے، وہاں بھی ایسی چیزیں

دیکھیں کہ بدن پر کپکپی طاری ہوگئی، وہاں ایذائیں دینے کے لئے بہت خطرناک آلات موجود تھے، ہڈی توڑنے اور جسم کا برادہ بنانے کی مشینیں وہاں نصب تھیں، پہلے پیر، پھر سینہ، سر اور ہاتھوں کی ہڈیاں باری باری توڑی جاتی تھی، مشین کے دوسرے سرے سے ہڈیوں کا برادہ اور انسانی گوشت کا قیمہ خون کے ساتھ نکلتا تھا۔ ایک چھوٹا پنجرہ نظر آیا جو انسان کے سر کے برابر تھا اس میں انسان کا سر داخل کر کے مقفل کر دیا جاتا، پھر ہاتھ پیر زنجیروں سے جکڑ دیئے جاتے تھے، اس کے بعد پنجرہ کے اوپر ایک سوراخ سے ٹھنڈے پانی کی ایک ایک بوند تسلسل کے ساتھ اس کے سر پر ڈالی جاتی تھی، قیدی کی موت تک یہ سلسلہ جاری رہتا، بہت سے لوگ اس ایذا سے پاگل ہو جاتے۔

ایذا اور تعذیب دینے کا ایک آلہ تابوت نما صندوق کی شکل میں تھا جس میں نوکیلی چھریاں اور خنجر نصب تھا، اسی طرح صندوق کے ڈھکن میں بھی نوکیلے آلے موجود تھے، مظلوم قیدی کو اس میں لٹا کر ڈھکن کو بند کر دیا جاتا جس سے اس شخص کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ وہاں ایک طرف ایسے ہک بھی دکھائی دیئے جن کو قیدیوں کی زبان یا عورتوں کے پستانوں میں داخل کر کے کھینچا جاتا، جس سے ان اعضاء کے ٹکڑے بکھر جاتے تھے، لوہے کے کوڑے بھی تھے، جن سے مظلوموں کو برہنہ کر کے اتنا مارا جاتا کہ ان کی ہڈیاں ٹوٹ جاتیں اور گوشت جسم سے الگ ہو جاتا، ہم کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ''اس خوف ناک عذاب کا سلسلہ تین صدیوں تک کیسے جاری رہا'' چشم دید حالات کی یہ تفصیلات فرانسیسی کمانڈر کی زبانی ہیں، لیکن المسلم ویب سائٹ پر ڈاکٹر سعید العتیبی کا ایک مضمون ۳۰ر گوشت ۲۰۰۸ء میں ظاہر ہوا جس سے معلوم کہ ہوا کہ اسپین حکومت نے ان تمام آلات اور مشینوں کو ایک میوزیم میں محفوظ کر دیا ہے، عیسائی مذہب کے ماننے والوں کے ان آلات مظالم نے موجودہ حکومت کو شاید جفا سے توبہ کرنے یا توبہ ظاہر کرنے پر مجبور کیا کہ شاید لوگ اس سے عبرت حاصل کر کے اپنا متعصّبانہ رویہ تبدیل کریں، انہوں نے اپنے مقالہ میں اسی طرح کے ایک میوزیم کا تذکرہ کیا ہے جس میں یہ سب کچھ محفوظ ہے، اس کا خلاصہ بھی ہم یہاں درج کر رہے ہیں:

''ہم لوگ ''مربلہ'' سے ''رُندہ'' پہنچے اور ابوالبقاء میدان کے ایک سرے پر اپنی گاڑی کھڑی کی، مذکورہ ابوالبقاء ''رُندہ'' کے وہ شاعر ہیں جنہوں نے سقوطِ اندلس کے المیہ کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا اور سقوطِ اندلس سے کچھ پہلے انہوں نے ایک نہایت غمگین مرثیہ لکھا تھا، اسپین کی حکومت نے اس میدان کا نام اسی شاعر کے نام پر ابوالبقاء اسکوائر رکھا ہے، رُندہ میں ہم نے وہ بدترین میوزیم دیکھا جس میں ان اسپینی عیسائی ظالموں کی ظالمانہ تاریخ موجود ہے، ہم جب اندلس کے مسلمانوں پر اندوہناک مظالم کے بارے میں پڑھتے تھے تو مبالغہ محسوس ہوتا تھا لیکن اس میوزیم کے دیکھنے کے بعد ہم کو کوئی تردد نہیں رہا، بلکہ اگلوں نے جو تصویر کشی کی ہے وہ اب ہم کو کم نظر آنے لگی، ہم اس میوزیم میں بہت سی حقیقتوں سے واقف ہوئے، یہ ضرور ہے کہ وہاں انسانی ڈھانچے نہیں تھے لیکن ان کی جگہ اسپین کی حکومت نے موم اور دوسری دھاتوں کے انسانی ڈھانچے بنا کر تاریخ کی سچائیوں کو پیش کر دیا ہے، ہماری نظریں تاریخ کے اس عدیم المثال انسانیت سوز مظاہر پر

تھیں اور زبان پر ان وحشی شیطانوں کے لئے لعنت تھی جنہوں نے انسانی جسم میں رہ کر انسانیت کو شرمسار کیا تھا، میوزیم میں داخل ہوتے ہی وہی منظر سامنے آئے جن کا مشاہدہ نپولین کی فوج نے کیا تھا، میوزیم میں ان منظر کی پوری تصویر کشی کی گئی تھی، جہاں عدالت کا منظر تھا، ایک کرسی جس پر مسلمان قیدیوں سے اقبالِ جرم کرایا جاتا تھا لیکن بیٹھنے کی جگہ پر نہایت نوکیلی کیلیں تھیں جس پر بیٹھتے ہی انسان کی جان جسم سے نکلنے کے لئے بے تاب ہو جاتی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے یہ کرسی اپنے بیٹھنے والے کے گوشت، لہو اور ہڈیوں کا رشتہ ختم کر دیتی تھی، جسم پارہ پارہ ہوتا، مسلسل یہی عمل جاری رہتا، جس کی نشاندہی اس کرسی پر لگے زنگ سے ہوتی ہے کہ مسلسل خون صاف کرنے کے لئے اس کرسی کو پانی سے دھویا جاتا، اسی کے اثر سے اس میں زنگ لگ گیا، ہمارے سامنے زنگ آلود کرسی اسی حقیقت کو بیان کر رہی تھی۔

چشمِ تصور میں وہ مظلوم اور بے گناہ مسلمان جوان، بچے، بوڑھے، مرد و عورت سب تھے کہ یہ نوکیلی دھاتیں دھیرے دھیرے ان کے سینوں، رانوں، پنڈلیوں اور پیٹ میں داخل ہو رہی تھیں، اور اب ان کا کرب ہم محسوس کر رہے تھے، بلکہ ایک عجیب صدمے سے دوچار تھے، بے اختیار ان انسان نما وحشیوں پر زبانوں سے لعنتیں جاری ہو گئیں، یہ ان ظالم و جابر وحشی اسپینی حکمرانوں کا ایسا عار ہے جو کبھی دھل نہیں سکتا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا کام صرف ایذائیں دینے کی نئی نئی ترکیبیں نکالنا اور اس کی مشینیں اور آلات ایجاد کرنا تھا۔

ان مختلف آلاتِ قتل میں ایک آلہ ایسا تھا جس سے آدمی دھیرے دھیرے مرتا ہے، دوسرا آلہ وہ تھا جس سے تکلیف کے ساتھ گلا دبایا جاتا تھا، بہت خطرناک قسم کے ہک جن سے جسم کے اعضاء کے پرخچے اڑائے جاتے تھے، وہاں ایسے آلے نمونے کے طور پر موجود تھے جن سے جسم کے دو حصے کر دیئے جاتے تھے، ایسے پنجرے جس میں قیدی موت تک کھڑا رہے، آڑے پنجرے جس میں انسان مرنے تک لیٹا رہے، خطرناک رسیاں جو جسم کے حصوں کو باندھ کر مختلف سمتوں میں کھینچتی تھیں ایک آلۂ قتل ایسا بھی تھا جس سے آہستہ آہستہ پیچھے سے گردن کو دبایا جاتا تھا، جس میں کیلیں بھی پیوست تھیں، ایک آلۂ قتل ایسا تھا جس سے پیٹھ اور ریڑھ کی ہڈی توڑی جاتی تھی۔ ان ظالمانہ آلات اور ان کے ذریعہ سزاؤں کی سچی تعبیر موم کے پتلوں کے ذریعہ اتنی مہارت سے پیش کی گئی ہے کہ ان کو دیکھ کر میں لرز اٹھا اور اچانک بے ارادہ چیخنے لگا، دوستوں اور دوسرے سیاحوں کی مدد سے میرے ہوش واپس آئے، سچائی یہی ہے کہ یہ ایسے منظر تھے جو شاید کسی بھی دیکھنے والے کو بے ہوش کر دینے کیلئے کافی تھے۔ اسپین کے متعصب بادشاہ اور ظالم پادریوں نے یہ حشر ان مسلمانوں کا کیا جو ان کے سب سے بڑے محسن تھے، جنہوں نے اپنے آٹھ سو سالہ دورِ حکومت میں اس خطہ کو علم و دانش اور تہذیب و تمدن کی جنت اور دنیا کی سب سے ترقی یافتہ مملکت بنا دیا تھا اور پھر یہی تہذیب و ترقی شمالی یورپ کی طرف منتقل ہو کر یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کا ذریعہ بنی تھی لیکن مسیحی دنیا کی یہ بے غیرتی بھی کم تکلیف دہ نہیں کہ ان کی زبانیں اب بھی یہی کہتی ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا، ان کے اندر حسد اور دلوں کی سختی اور ان کے مزاجوں کی درندگی اس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے۔

☆

تبصرہ نگار: ن، ر

تبصرے کے لئے کتاب کے دو نسخے ارسال کرنا ضروری ہے۔ پمفلٹ نما کتابچوں پر تبصرہ نہیں کیا جائے گا۔ (ادارہ)

فوائد نافعہ: تالیف: حضرت مولانا محمد نافع صاحب دامت برکاتہم۔ ناشر: دارالکتاب، اردو بازار، لاہور۔ صفحات، جلد اول: ۶۸۸، جلد دوم: ۳۰۲۔ سائز: 23x36/16، قیمت: ۳۹۰ روپے۔

بلاشبہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم وہ خوش قسمت ترین اور قابل رشک جماعت ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت صحبت کے لئے منتخب فرمایا تھا، اہل سنت و جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ صحابہ کرامؓ معیار حق اور مدار دین ہیں اور یہ کہ تمام صحابہؓ عادل اور ثقہ ہیں، اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے بعد وہ "افضل الخلق" ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علوّ استعداد اور جوہری کمالات کے پیش نظر "خیرامت" کا لقب عطا فرمایا، اور دنیا ہی میں اللہ تعالیٰ نے ﴿رضي الله عنهم ورضوا عنه﴾ فرما کر انہیں اپنی رضامندی کی سند عطا فرمادی۔

مگر ایک طویل عرصے سے روافض اور بعض مخصوص حلقوں کی طرف سے ان ستودہ صفات ہستیوں پر ایک مستقل مشن کے طور پر طعن و تشنیع اور اتہام طرازی کا سلسلہ جاری ہے اور انہیں مسلسل سنگہائے ملامت کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ اہل سنت و جماعت کی طرف سے ان حضرات کے دفاع میں ہر زمانہ میں متعدد بیش بہا کتب لکھی گئیں، جنہوں نے مخالفین کے دانت کھٹے کردیئے، اور یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو دور حاضر کے عالی قدر اور بلند پایہ محقق حضرت مولانا محمد نافع صاحب دامت برکاتہم کی تالیف ہے، حضرت نے اپنی زندگی ان پاک طینت ہستیوں کے دفاع کے لئے وقف کر رکھی ہے اور قلم کے اس جہاد میں انہوں نے دشمن پر مضبوط دلائل کے جان لیوا وار کر کے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کردیا ہے۔

زیر نظر کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں پانچ فصلیں ہیں: پہلی فصل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سوانح وسیر اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل ومناقب اور روافض کی

جانب سے ان پر وارد کردہ اعتراضات ومطاعن اور ان کے دندان شکن جوابات پر مشتمل ہے۔ دوسری فصل واقعہ قرطاس اور اس کا پس منظر، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر شک فی النبوت اور مسائل شرعیہ سے ناواقفیت کے مطاعن کے جواب، مسئلہ تراویح، متعۃ النساء کا مسئلہ، طلقات ثلاثہ کا مسئلہ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ پر وارد کردہ مطاعن کے جواب جیسے اہم مضامین پر مشتمل ہے۔ فصل سوم میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور فصل چہارم میں مختلف صحابہ کرامؓ پر وارد کردہ مطاعن کے جواب دیئے گئے ہیں، جب کہ فصل پنجم میں روافض کی الفلح اکیڈمی کراچی کی جانب سے شائع کیے گئے ایک اشتہار کا منہ توڑ جواب دیا گیا ہے، جس میں اکابر صحابہ کرامؓ پر کیچڑ اچھالنے کی مکروہ کوشش کی گئی ہے۔

دوسری جلد حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی مفصل سوانح حیات، استخلاف یزید، واقعہ کربلا سے متعلق چند مباحث، ماتم کا مسئلہ، امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے احوال زندگی، قاتلین حسینؓ کا عبرت ناک انجام جیسے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں بعض مطاعن کے جواب کے علاوہ مختلف تاریخی واقعات ومسائل بھی زیر بحث لائے گئے ہیں۔ فاضل مؤلف کا اسلوب ان کی دیگر کتب کی طرح اس کتاب میں بھی ناصحانہ اور ہمدردانہ ہے، جارحانہ اور شاتمانہ ہرگز نہیں۔ ان کے انداز میں جان بھی ہے اور زور وقوت بھی، مگر زور بیان میں بھی احتیاط کا دامن وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تفسیر، حدیث اور فقہ میں انہیں قابل رشک مہارت حاصل ہے، تاریخ پر بھی ان کی نظر وسیع ہے، تاریخ میں در آنے والی بے بنیاد روایات کی حقیقت سے ان کو خوب آگہی حاصل ہے، چنانچہ ایسی روایات پر انہوں نے زبردست علمی گرفت کی ہے اور اپنا مدعیٰ قرآن، حدیث اور معتبر حدیثی وتاریخی روایات کی مدد سے اس طرح ثابت کیا ہے کہ ایک حقیقت پسند اور منصف مزاج انسان کے لئے حقیقت تک رسائی بالکل آسان ہو جاتی ہے۔ کتاب کی طباعت وسیٹنگ میں سلیقہ مندی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

سیرت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ: تالیف: مولانا محمد نافع صاحب مدظلہ۔ ناشر: دار الکتاب، اردو بازار، لاہور۔ صفحات، جلد اول: 658، جلد دوم: 400، مجموعی قیمت: 600 روپے، سائز: 23×36/16۔

حضرت مولانا محمد نافع صاحب دامت برکاتہم ان قابل رشک ہستیوں میں سے ہیں، جنہوں نے اپنی زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک طینت جانثار صحابہؓ کے دفاع کے لئے وقف کر رکھی ہے، "مشاجرات صحابہؓ" پر لکھی گئی ان کی ہر کتاب آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، بل کہ بلا مبالغہ اس موضوع پر اردو لٹریچر ان کی کسی بھی کتاب کی نظیر ومثل پیش کرنے سے قاصر ہے۔ خصوصاً ان کی کتاب "رحماء بینهم" تو علم وتحقیق کے اعتبار سے ایک ایسی وقیع اور بلند پایہ کتاب ہے کہ کسی بھی زبان میں اس کی نظیر نہیں۔ زیر نظر کتاب "سیرت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ"، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے، بھی اسی سنہری سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ وہ مظلوم صحابی ہیں، جن پر اغیار تو رہے، "بعض احباب" نے بھی کذب واختراع کے طومار باندھے ہیں اور اعتراضات ومطاعن کے زہر میں بجھے تیروں سے ان کی شخصیت کو چھلنی چھلنی کر دیا ہے، فاضل مؤلف نے حضرت امیر معاویہؓ کے دفاع اور ان کی بے داغ اور روشن سیرت کو اجاگر کرنے کے لئے ہی یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ پہلی جلد حضرت امیر معاویہؓ کی

سیرت وسوانح اور وقائع زندگی پر مشتمل ہے، جسے فاضل مؤلف نے چار ادوار میں تقسیم کر کے بیان کیا ہے۔ پہلا دور ان کی ولادت سے عہد نبوی کے اختتام تک ہے، اس میں فاضل مؤلف نے حضرت امیر معاویہؓ کی ولادت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی تعلقات، قبول اسلام، غزوات میں شرکت، عہد نبوت میں ان کے منصب ومقام، کارناموں اور مناقب وفضائل صحیح روایات کی روشنی میں بیان کئے ہیں۔ دوسرا دور عہد صدیقی سے شہادت حضرت عثمان غنیؓ تک ہے، اس میں انہوں نے خلفائے ثلاثہ کا حضرت امیر معاویہؓ کی قدر دانی، ان پر کلی اعتماد وحسن ظن کا اظہار، خلفائے ثلاثہ کے عہد میں ان کی خدمات وکارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ تیسرا دور عہد علوی سے صلح حضرت امام حسنؓ تک ہے، اس میں فاضل مؤلف نے حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لئے حضرت امیر معاویہ کی طرف سے کی گئی حفاظتی تدابیر، حضرت عثمانؓ کی المناک شہادت، اس کے نتیجے میں ہونے والے اہم واقعات، خلیفہ چہارم کی بیعت، حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے باہمی اختلافات، جنگ صفین اور اس کا پس منظر، فریقین میں صلح کی مساعی، واقعہ تحکیم، مشاجرات صحابہ سے متعلق سلف صالحین کی ہدایات بیعت خلافت سیدنا حسنؓ، حضرت امیر معاویہ کے حق میں ان کی دستبرداری اوران سے صلح وغیرہ جیسے اہم مضامین ٹھوس ومستند روایات کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں۔ دور چہارم حضرت امیر معاویہؓ کے عہد خلافت پر مشتمل ہے۔ اس میں فاضل مؤلف نے خوارج کے خروج، ان کی سرکوبی، بغاوتوں کو فرو کرنے کی ان کی مساعی، ان کے مختلف کارناموں، اسلامی حکومت میں توسیع کے لئے ان کی متعدد جنگی مہمات، فتوحات، رفاہی وترقیاتی خدمات، علمی وثقافتی کارناموں، فقہی اجتہادات، بیعت یزید کا مسئلہ، اہل بیت کے ساتھ ان کے خوش گوار تعلقات اور ان کے اعزاز واکرام کے واقعات کا مبسوط ومحقق جائزہ لیا ہے۔ اور بالکل آخر میں حضرت امیر معاویہؓ کے بارے میں اکابرین امت کے تاثرات بیان کئے گئے ہیں۔ ان چاروں ادوار کے ضمن میں بعض شبہات کا ازالہ بھی کیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر روافض اور دیگر حلقوں کی طرف سے وارد کردہ تقریباً اکتالیس مطاعن واعتراضات کے جواب دیئے گئے ہیں۔ مطاعن کے جواب سے پہلے تقریباً پچیس صفحات پر مشتمل بطور تمہید چند اہم امور وضوابط بیان کئے گئے ہیں۔ مطاعن کے جواب میں فاضل مؤلف نے مجادلانہ ومناظرانہ نوک جھونک اور عبارتی گرفت کے بجائے سنجیدہ وناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے نہایت ٹھوس تحقیقی انداز میں مدلل معلومات پیش کی ہیں۔ نیز غیر مستند روایات کا سہارا لینے کے بجائے مضبوط دلائل کے ساتھ اپنا مدعی ثابت کیا ہے۔ کسی روایت پر نقد کرتے وقت اس کے تمام طرق پیش نظر رکھتے ہیں، جو ایک ماہر محدث نقاد ہونے کی نشانی ہے۔ انہوں نے بطور تائید یا الزام شیعی مآخذ کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ کے دفاع میں اپنے قلم کو انہوں نے بہکنے نہیں دیا، حالانکہ مشاجرات صحابہ بخصوصاً حضرت امیر معاویہؓ سے متعلق مشاجرات ایک ایسی راہ پرخار ہے، جس پر دامن بچا کر چلنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر لکھنے والے بہت کم حضرات افراط وتفریط سے بچ پائے ہیں۔ فاضل مؤلف بھی انہی "قلیل" میں سے ہیں۔ غرض یہ اپنے موضوع پر ایک بے نظیر وجاندار کتاب ہے۔ باقی کتاب کی کمپوزنگ وسیٹنگ میں سلیقہ مندی کی گنجائش ہے۔ نیز پروف ریڈنگ کی غلطیاں بھی کھٹکتی ہیں۔

☆

اور محبتِ صالحین کی تلقین کرنے کے ساتھ باہمی اتحاد و اتفاق کی ضرورت پر زور دیا۔انہوں نے علماء کرام کو مطالعہ میں وسعت اور حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھنے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی عوام سے مختلف انداز سے رابطہ بڑھانے پر زور دیا۔انہوں نے کہا کہ رابطہ کے لیے دروسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جائے اور مدارس کے جلسوں میں ایک نشست باوقار بنا کر افسران، سیاسی زعما اور مختلف طبقہ کے لوگوں کو شریک کیا جائے۔ نیز اپنے ادارہ کے تحت رفاہی کام کیئے جائیں اور عوام کی خدمت کی جائے۔ اگر ممکن ہو تو مدارس کی سرپرستی میں معیاری سکول بھی قائم کیئے جائیں۔انہوں نے فرمایا کہ ہم وفاق المساجد بنانے کی تجویز پر غور کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ مساجد میں پڑھانے کے لئے ایک شارٹ کورس بھی ترتیب دیا جائے گا۔انہوں نے مدارس میں دارالافتاء کے ساتھ دارالقضاء کے قیام کی ضرورت پر زور دیا تا کہ لوگوں کے معاملات شرعی طور پر حل کیئے جاسکیں اور عوام سے رابطہ بھی بڑھ جائے۔انہوں نے میڈیا سے رابطہ بڑھانے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔غیر موزوں مضامین کے جوابات لکھنے کی طرف متوجہ فرمایا، انہوں نے فرمایا کہ طلباء میں تحقیقی مادہ پیدا کیا جائے اور قوتِ تحریر بھی اُجاگر کی جائے۔

انہوں نے کہا کہ ہمیں اپنے ناموں کے ساتھ اہل السنّت والجماعت کا لفظ لکھنا چاہئے اور ربیع الاوّل اور محرم الحرام میں عوامی اجتماعات منعقد کرنے چاہیں، مدارس کے بورڈز اور پمفلٹوں پر ملحقہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان ضرور لکھنا چاہے، اس کے ساتھ مدارس میں آنے جانے والوں پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے نیز مدارس میں غیر تعلیمی سرگرمیوں پر پابندی لگانی چاہئے۔

اجلاس کی اس نشست کا اختتام حضرت مولانا ارشد الحسینی صاحب مدظلہ کی دعا پر ہوا۔

یہ اجلاس جامعہ اسلامیہ باب العلوم کی جامع مسجد میں منعقد ہوا، نماز ظہر کے متصل بعد کنونشن کی دوسری نشست کا آغاز ہوا۔کنونشن کے لئے جامعہ باب العلوم کے وسیع وعریض پلاٹ میں پنڈال بنایا گیا تھا۔اس پنڈال میں دو ہزار سے زائد افراد کے لئے خوبصورت کرسیاں لگائی گئی تھیں، پنڈال کے کناروں پر بامعنی اور بامقصد تحریروں پر مشتمل بینرز آویزاں تھے۔

اس نشست کی کاروائی کے ناظم مولانا محمد شریف صاحب تھے۔سٹیج پر موجود کثیر تعداد میں علماء کرام میں وفاق المدارس کے رکن عاملہ اور مسئول مولانا مفتی عطاء الرحمٰن اور جامعہ صدیقیہ بہاولپور کے مدیر قاری غلام یٰسین صدیقی، اور دار العلوم رحیمیہ ملتان سے قاری محمد ادریس ہوشیارپوری بھی شامل تھے۔کنونشن کی اس دوسری نشست سے خطاب کرنے والوں میں حضرت مولانا محمد ظفر قاسم، راقم الحروف زبیر احمد صدیقی، حضرت مولانا محمد نواز صاحب ملتان، اور مولانا محمد میاں شامل تھے۔کنونشن میں کثیر تعداد میں سیاسی زعماء، وکلاء، صحافی اور تاجروں نے شرکت کی۔پنڈال کھچا کھچ بھر چکا تھا۔آخر میں حضرت ناظم اعلیٰ صاحب مدظلہ کو دعوتِ خطاب دی گئی۔انہوں نے اپنے پُر جوش اور مدلل خطاب میں مدارس کا مقدمہ عوام کی عدالت میں پیش فرمایا۔

انہوں نے فرمایا کہ ہم پاکستان بنانے والوں کی اولاد ہیں، پاکستان ہمیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ مدارس کے طلبہ ملک کے پہرے دار ہیں۔انہوں نے کہا کہ پاکستان کا اسلامی تشخص اور اسلامی آئین عالمی قوتوں کا ہدف ہے۔دینی مدارس ملک کی کسی بھی حکومت میں روڑے نہیں اٹکا رہے۔صرف اسلام کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔تعلیم کو فروغ دے رہے ہیں۔اس کے باوجود دشمن قوتیں مدارس کو مٹانا چاہتی ہیں مگر عالم کفر یاد رکھے کہ علماء مدارس ملک کے پاسبان ہیں، پاکستان پر میلی آنکھ سے دیکھنے والوں کی آنکھ پھوڑنے میں پہل علماء ہی کریں گے۔مدارس اسلام اور پاکستان کے چوکیدار ہیں، حکومت انہیں کمزور نہ کرے بلکہ عالمی قوتوں کے تحفظات دور کرنے کے لیے ہمیں مواقع دے، ہم مدارس کی حقیقت سے امریکا، یورپ اور دیگر قوتوں کو آگاہ کریں گے، ہم مدارس کی آزادی خودمختاری پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔

انہوں نے فرمایا کہ حکومت مدارس کو ہراساں کرنا، بے بنیاد چھاپے مارنا بند کرے اور ہمیں مزاحمت پر مجبور نہ کرے، ہم ملک کے نازک اور سنگین ترین حالات کی وجہ سے خاموش ہیں اور ہم مدارس کے تحفظ، خودمختاری اور آزادی کا تحفظ کرنا جانتے ہیں۔

اس کنونشن کو بحمد اللہ بھرپور مقبولیت نصیب ہوئی۔کنونشن کی کامیابی میں جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑپکا کے استاذ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا منیر احمد، مولانا محمد افتخار، باب العلوم کے طلباء اور مولانا عبدالرحمٰن جلوی، قاری محمد اکرم دنیاپور کی محنت بھی شامل تھی۔